اتنی عام ہوتی جاتی ہے، کہ بیشتر رسائل اسی جنس لطیف سے معمور رہتے ہیں، ہر نوجوان کی پہلی قلمی کوشش کی جولانگاہ افسانون ہی کا میدان ہوتا ہے، لیکن افسانون کی اس مقبولیت اور ارزانی کے باوجود ہماری زبان میں فن افسانہ نگاری پر دو چار مختصر مضامین اور دو ایک ابتدائی تصانیف کے علاوہ کوئی مستقل کتاب نہ تھی، سید وقار عظیم صاحب نے "افسانہ نگاری" لکھ کر ایک حد تک اس کمی کو پوری کر دیا ہے، اس کتاب میں فنی حیثیت سے افسانہ نگاری کے اصول، ضوابط، اس کے اجزا، مثلاً افسانہ کی حقیقت، اس کی سُرخی، اسکی ترتیب، ابتدا و خاتمہ، افسانہ و کردار نگاری، افسانہ و حقیقت، افسانہ و محبت، اور اتحاد اثر وغیرہ افسانے کے تمام اجزا، اور اس کے لوازم و شرائط پر تفصیلی بحث ہی، یہ کتاب نو مشق افسانہ نویسون کے لئے مفید اور لائق مطالعہ ہے،

**ہماری افسانے**، مصنفہ سید وقار عظیم صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۴۴، صفحات، کاغذ سپید کتابت وطباعت اچھی، قیمت عہ، پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد،

یہ کتاب گویا پہلی کتاب "افسانہ نگاری" کا تتمہ اور تکملہ ہے، اس میں فنی حیثیت سے پہلی کتاب کے مباحث پر کوئی جدید اضافہ نہیں ہے، بلکہ ابتدا میں افسانہ نگاری کی مختصر تاریخ ہے، پھر افسانون کے اقسام مقامی رنگ کے افسانے، اصلاحی افسانے، تراجم، رومانی، جاسوسی اور ہیبت ناک افسانے وغیرہ پر بحث ہے، اور جا بجا "افسانہ نگاری" میں بتائے ہوئے اصول وضوابط کی روشنی میں ان کی وضاحت و تشریح کی گئی ہے، آخر میں ہندوستان کے مشاہیر افسانہ نگارون کی خصوصیات اور فنی نقطۂ نظر سے ان پر تبصرہ کیا گیا ہے جس سے فن افسانہ نگاری کے اصول وضوابط ذہن نشین ہوجاتے ہین، غالباً یہ کتاب مصنف کی پہلی قلمی کوشش کا ثمر ہیں، اس لئے زبان میں خامی اور ناہمواری ہے جو امید ہو کہ مشق ومزاولت سے دور ہو جائیگی،



جلد ۳۸ | ماہ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۳۶ء | عدد ۵

## مضامین

| | | |
|---|---|---|
| شذرات، | سید سلیمان ندوی، | ۳۲۲-۳۲۴ |
| تابعین کے علمی اور مذہبی کارنامے، | شاہ معین الدین احمد ندوی، | ۳۲۵-۳۳۸ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم، | جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم اے حیدرآباد دکن، | ۳۳۹-۳۵۱ |
| کلام لطف، | مولوی محمد نصیر الدین صاحب علوی اشعری مسلم یونیورسٹی | ۳۵۲-۳۶۴ |
| مذاہب اربعہ مین فطرت کا لگاؤ، | جناب جوش بلگرامی، | ۳۶۵-۳۷۵ |
| ذیج جنوبی افریقہ میں مسلمانون کی حالت، | مولوی محمد اسمٰعیل گا چھیلہ صاحب، | ۳۷۶-۳۷۹ |
| رومن کیتھولک چرچ اور اسلام، | "ع ز" | ۳۸۰-۳۸۶ |
| امریکہ مین سرطان کے علاج کی تدبیرین، | " | ۳۸۶-۳۸۷ |
| اخبار علمیہ، | " | ۳۸۸-۳۹۱ |
| دعا، | جناب اسد صاحب بی اے ملتانی، | ۳۹۲ |
| سخن ماہر، | جناب ماہر القادری صاحب، | ۳۹۲-۳۹۳ |
| کیف تغزل، | مولوی محمد مبین صاحب کیفی، | ۳۹۳ |
| "اہل ہند کی زندگی اور حالات"، | "ص ع" | ۳۹۴-۳۹۶ |
| مطبوعات جدیدہ | "م" | ۳۹۷-۴۰۰ |

# شذرات

ہندوستانی زبان کی ترقی وتحفظ کے مسئلہ پر غور کرنے کیلئے ۲۴-۲۵-اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علیگڈھ مین اردو کانفرنس کے دو عام اجلاس اور ایک خاص مشاورتی جلسہ منعقد ہوا، بنگال، بہار، مدراس اور پنجاب کے متعدد اور صوبہاے متحدہ کے اکثر اہل قلم واہل ادب واہل الرائے موجود تھے، پہلے عام اجلاس مین صدر استقبالیہ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی طرف سے کہ وہ بیمار تھے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے خطبۂ استقبال پڑھا، پھر صدر منتخب جناب راجہ صاحب محمود آباد نے جن کو شاید پہلی دفعہ اس قسم کے مجمعون مین شرکت کا اتفاق ہوا ہوگا، اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، ان خطبون مین کوئی بات نہ تھی لیکن بہرحال ان سے اجلاس کا رسمی افتتاح ہوگیا، اور کل کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی گئی،

اس سب کمیٹی نے ۲۵ کی صبح سے لیکر دوپہر تک اپنا کام کیا، اور ہندوستانی زبان کو پورے ملک مین پھیلانے اور ترقی دینے کی تجویزون پر غور کیا، اور ایک ایسا خاکہ تیار کیا کہ جس پر چند سال بھی اگر مستعدی وگرمجوشی کیساتھ کام کیا گیا، تو یقین ہے کہ ہماری زبان کی جغرافی اور معنوی وسعت اب سے دوچند ہو جائیگی، یہ بھی طے پایا کہ انجمن ترقی اردو کا مرکز دلی قرار دیا جائے، اور سارے صوبون اور دیسی ریاستون مین اسکی شاخین قائم ہون، اور ان کے تحت ذیلی انجمنین قائم کیجائین اور کوشش کیجائے کہ ہر صوبہ کے سرکاری دفترون اور درسگاہون مین ہندوستانی کو وہ حیثیت دیجائے جس کی وہ مستحق ہے، یہ بھی طے پایا کہ دہلی مین ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ اور ایک کتبخانہ قائم کیا جائے، انجمن کے لئے تین کمیٹیان بنائی گئین جنمین سے ایک اصلاح زبان وخط ورسم الخط کے مسئلون پر غور کریگی، دوسری ادبی مجلس ہوگی جس کے ارکان انجمن کے سلسلۂ تصنیف وتالیف وترجمہ کے متعلق رائین دینگے اور تیسری کمیٹی انجمن کے مطبع اور اشاعت خانہ کے متعلق تجاویز پیش کریگی،



دوسرے عام اجلاس مین سب کمیٹی کے مجوزہ لائحۂ عمل کو پڑھکر سنایا گیا، اور حاضرین نے بالاتفاق اسکو منظور کیا، اس اجلاس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن نے فرمائی، موصوف نے ہندوستانی زبان اور اس زبان مین تعلیم کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن پرمغز تقریر فرمائی جس کو حاضرین نے توجہ کے ساتھ سنا، آخر مین نواب صدر یار جنگ بہادر نے صدر کے اور مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری نے حاضرین اور منتظمین کے شکریہ کا فرض ادا کیا، اور جلسہ ختم ہوگیا،

یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی گویا پہلی کانفرنس تھی، نہ اس مین پرجوش تقریرین ہوئین، نہ ہنگامہ آرا تجویزین پیش ہوئین، نہ مجوزین اور مؤیدین کے نامون کی نمائش ہوئی، نہ تجویزون کی مخالفت اور ترمیم کا شور بلند ہوا، سکون اور اطمینانِ خاطر کے ساتھ چند کام کرنے والے جمع ہوئے، اور اتفاق واتحاد کے ساتھ سب نے ملکر کچھ تجویزین پیش کین اور منظور کین، اور آیندہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کیا،

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت اسکی نمایندہ حیثیت تھی، شاید یہ پہلا موقع ہو جب سیاسیات کے پرشور ہنگامون کے بغیر کچھ سوچنے والے اور کام کرنے والے لوگ ملک کے مختلف حصون سے اکٹھے ہوے، اور انکی ایک ایسی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی جس کو دیکھکر یہ ماننا پڑا کہ اہل ملک مین اپنی زبان کی ترقی وتحفظ کا خیال پہلے سے بہت زیادہ ہے، ہمارے لئے یہ بھی تسکین کا باعث تھا کہ جلسہ مین ہندوستانی زبان کے ہندو اہل قلم واہل ادب بھی شریک تھے،
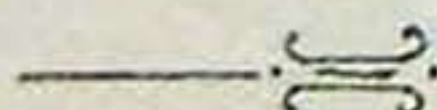
افسوس ہے کہ اس جلسہ مین ہندی اور ہندوستانی کا وہ ادیب موجود نہ تھا جس کا قلم ان دونون دریاؤن کا سنگم تھا یعنی منشی پریم چند، ماسوف علیہ نے اسی مہینہ اپنے دوستون کو آخری الوداع کہا، اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کے قلم نے کم ازکم پچیس برس تک اپنے دیہاتی بھائیون کی کہانی اپنے شہری بھائیون کو سنائی، وہ زبان کے پرجوش فصیح وبلیغ نہ تھے، ان کی عبارت تکلف اور بناوٹ سے پاک اور حد درجہ سادی تھی، ان کی کہانیون

کا اثر ان کی زبان ہی میں نہ تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انھوں نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع و آداب، اور ہندی اخلاق اُن بان کی جو تصویرین کھینچی ہین وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندۂ جاوید یادگارین ہین،

---

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن جو ہمارے ملک مین نادر عربی کتابون کا واحد اشاعت خانہ ہے، اب وہ اپنی ترقی کے نئے دور مین قدم رکھ رہا ہے، اب اس کے لائق مہتمم ہمارے عزیز مولانا سید ہاشم صاحب ندوی رکن دائرۃ المعارف مقرر ہوئے ہین، وہ دن رات اس کی ترقی اور دست برد انقلاب سے اس کے بچانے کی فکر مین مصروف رہتے ہین، چند نئی کتابین چھپکر شائع ہوئی ہین، اور کچھ زیر تصحیح اور زیر طبع ہین،

---

تازہ اشاعت پذیر کتابون مین سنن کبریٰ بیہقی کی آٹھوین جلد ہے جس مین نفقات وحدود وانتزاع کے ابواب ہین، اور دو نادر کتابین جو امع کتاب اصلاح المنطق، اور کتاب احکام الوقف ہین، اول الذکر کتاب تیسری صدی ہجری کے مشہور ادیب ولغوی ابن سکیت کی مشہور تصنیف اصلاح المنطق کی تہذیب ہے، جس کو چوتھی صدی ہجری کے ایک بغدادی ادیب زید بن رفاعہ نے انجام دیا ہے، دوسری کتاب قاضی ابو یوسفؒ کے شاگرد ہلال بن یحیی الرائی البصری المتوفی ۲۴۵ھ کی تصنیف ہے، اس مین وقف کے مسائل کی تفصیل وتشریح کی گئی ہے، اس مین بیان کا طریقہ بالکل نیا اختیار کیا گیا ہے، یعنی سوال وجواب اور مکالمہ کی صورت مین، اور ایک دلچسپ رسالہ امام رازی کے مناظرات پر شائع ہوا ہے، امام موصوف کو ماوراء النہر کے مختلف شہرون مین علمائے وقت سے متعدد مناظرے کرنے پڑے، انہین مناظرون کو امام نے اس رسالہ مین جمع کیا ہے،

---

خدا کا شکر ہے کہ سیرت نبویؐ کی چھٹی جلد جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس مہینہ مطبع مین دے دی گئی، پوری کتاب شاید تین سو صفحون مین تمام ہو، اور ۱۹۳۶ء کے آخر مین چھپکر شائع ہو،

---



# مقالات

## تابعین کے علمی و مذہبی کارنامے

### (۲)

از شاہ معین الدین احمد ندوی،

فقہ میں تابعین کا درجہ،

فقہ یعنی حلال وحرام کے مسائل کا علم، اور اصول سے مسائل کا استخراج واستنباط یہ علم بھی تابعین کی علمی موشگافیوں کا مرہون منت ہے، انہی نے اسکو فن بنایا، بلکہ یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا، کہ انہی کے فیض سے فقہ کے مذاہب قائم ہوئے، اس لئے کہ ائمۂ مذاہب سب کے سب انہی کے حلقۂ درس کے تربیت یافتہ تھے، تابعین کی جماعت میں علمائے فقہ کی بہت بڑی تعداد تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہین،

ابراہیم نخعی اپنے وقت کے امام فقہ تھے، امام شعبی انھیں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فقیہ مانتے تھے،[۱] سعید بن جبیر جو خود بڑے فقیہ تھے، ان کی موجودگی میں فتویٰ کا جواب نہ دیتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ ابراہیم کی موجودگی میں مجھ سے پوچھتے ہو،[۲] اہل بیت میں امام جعفر صادق کا تفقہ مشہور تھا، ان کے تفقہ کی یہ سند کافی ہے، کہ امام ابو حنیفہ ان کے خرمن فقہ کے خوشہ چیں تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بڑا فقیہ نہیں دیکھا،[۳] حسن بصری مسائل حلال وحرام کے سب سے بڑے عالم تھے،[۴] ربیع بن انس کا بیان ہے، کہ میں کامل دس سال تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، اور روزانہ ان سے نئے نئے مسائل معلوم ہوتے تھے،[۵] بعض روایتون سے

۱؎ تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۱۰۴، ۲؎ ایضاً، ۳؎ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۵۰، ۴؎ ابن سعد جلد ۷ ق اول ص ۱۱۸، ۵؎ تہذیب التہذیب جلد ۲

معلوم ہوتا ہے، کہ فقہ میں ان کا ایک خاص مذہب تھا، جس کے بہت سے پیرو تھے، لیکن زیادہ دنوں تک رہ نہیں سکا، ربیعہ رائی مدینہ کے فقیہ اعظم تھے، اجتہاد اور تفریع و استنباط مسائل میں انکو اتنی بصیرت حاصل تھی، کہ رائی ان کا لقب ہو گیا تھا[1]، صاحب مذہب ائمہ میں امام مالک اور امام ابو حنیفہ ان کے فیضیافتہ تھے، امام مالک ان کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کی موت کے وقت ان کی زبان پر تھا کہ آج فقہ کا مزا جاتا رہا[2]، امام ابو حنیفہ ان کی خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوتے تھے، اور ان کے اقوال و آراء کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے[3]، سعید بن جبیر کا تفقہ اکابر صحابہ میں مسلم تھا، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی خدمت میں اگر کوئی کوئی استفتے کے لئے آتا، تو فرماتے کیا سعید بن جبیر تمھارے یہاں نہیں ہیں[4]، سعید بن مسیب مدینہ کے سات مشہور عالم فقہاء میں سے ایک تھے، پھر ان ساتوں میں وہ امتیازی حیثیت رکھتے تھے، قتادہ کہتے تھے، کہ سعید بن مسیب سے زیادہ حلال و حرام کا واقفکار میں نے نہیں دیکھا، سلیمان بن موسیٰ ان کو افقہ التابعین کہتے تھے، ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں اہل مدینہ کے سردار اور فقہ و فتاویٰ میں سب پر فائق تھے، ان کو فقیہ الفقہاء کہا جاتا تھا[5]، ان کے تفقہ کا ایک بڑا سبب یہ تھا، کہ وہ آنحضرت صلعم اور شیخینؓ کے فیصلوں کے سب سے بڑے عالم تھے، حضرت عمرؓ کے فیصلوں کے خصوصیت کیساتھ بڑے حافظ تھے، اور راویہ عمر کہلاتے تھے[6]، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی ان کے تفقہ کے معترف تھے[7]، اور اکثر مسائل پوچھنے والوں کو ان کے پاس بھیجدیتے تھے[8]، امام شعبی اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ مانے جاتے تھے، بعض علماء انھیں سعید بن مسیب، طاؤس، عطاء، حسن بصری، اور ابن سیرین سے بھی بڑا فقیہ مانتے تھے[9]، ابراہیم نخعی جن کے تفقہ کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے، جب خود کسی مسئلہ کا جواب نہ دے سکتے تھے، تو سائل کو شعبی کے پاس بھیجدیتے تھے[10]، اس تفقہ کی بنا پر وہ صحابۂ کرام کی موجودگی ہی میں مسند افتا پر بیٹھ گئے تھے[11]

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۴۸، [2] تاریخ خطیب جلد ۸ ص ۴۲۳، [3] ر ر ص ۴۲۴، [4] تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۱۱۶
[5] ر ص ۲۲۰، [6] ابن سعد جلد ۵ ص ۹۰، [7] ر ر، [8] ابن خلکان جلد اول ص ۲۰۶، [9] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۷۰
[10] ابن سعد جلد ۶ ص ۱۷۴، [11] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۷۴



عطاء بن ابی رباح سادات فقہاء میں شمار ہوتے تھے[1]، عطاء کا مستقر مکہ تھا، یہاں کے بعض سائلین اکثر مسائل کو دوسرے صحابہ کی آمد کے لئے اُٹھا رکھتے تھے، چنانچہ جب عبد اللہ بن عمرؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ حج کے سلسلہ میں مکہ آتے، تو وہ لوگ ان سے پوچھتے، یہ دونوں بزرگ جواب دیتے، کہ عطاء کی موجودگی میں تم لوگ مجھ سے پوچھتے ہو، اور میرے لئے مسائل اٹھا رکھتے ہو[2]، امام اعظم فرماتے تھے، کہ میں نے عطاء سے افضل کسی کو نہیں پایا[3]، عمرو بن دینار مجتہد فقہاء میں تھے[4]، ابن عیینہ انھیں اس عہد کا سب سے بڑا فقیہ مانتے تھے[5]، عکرمہ کا خاص فن اگرچہ حدیث تھا، لیکن فقہ کے بھی وہ بڑے عالم تھے[6]، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے ان کو اپنی زندگی ہی میں فتوی دینے کا مجاز بنا دیا تھا[7]، عکرمہ جتنے دنوں تک بصرہ میں رہتے تھے، اتنے دنوں تک حسن بصری فتوی نہ دیتے تھے[8]، ان کی موت کے وقت ہر شخص کی زبان پر تھا، کہ آج "افقہ الناس" دنیا سے اٹھ گیا[9]، ابن سیرین باتفاق علماء وارباب فن فقہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے[10]، امام زہری نے اس عہد کے اکثر اکابر فقہاء کا علم اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا[11]، مسلم بن یسار کا شمار ائمہ فقہا میں تھا، مسروق بن اجدع فقیہ الامت عبد اللہ بن مسعودؓ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ان کا شغل درس و افتاء تھا[12]، مکحول شام کے سب سے بڑے فقیہ تھے[13]، ابو سلمہ بن عبد الرحمن کو بعض علماء مدینہ کے سات مشہور فقہاء میں شمار کرتے تھے[14]، مدینہ مرکز فقہاء تھا، اس لئے یہاں ائمہ فقہاء کی ایک جماعت ایسی تھی، جو ساری دنیائے اسلام میں فرد مانی جاتی تھی، باختلاف علماء ان کی تعداد سات سے دس تک ہے، ان میں سے بعضوں کے نام اوپر گذر چکے ہیں، کسی شاعر نے ان کے نام ایک قطعہ میں نظم کئے ہیں،

[1] تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۰۳، [2] ر ر و تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۳۳۴، [3] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۰، [4] تہذیب الاسماء جلد اول ق اول ص ۲۰، [5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۰۰، [6] تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۷۱، [7] تہذیب جلد اول ص ۲۶۵، [8] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۸۴، [9] ابن سعد جلد ۵ ص ۲۱۶، [10] دیکھو تہذیب و تذکرۃ الحفاظ وغیرہ ترجمہ ابن سیرین [11] تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴۵، [12] ر جلد ۱۰ ص ۱۱۱، [13] تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۱۱۳، [14] ر ر ص ۲۴۱،

اذا قیل من فی العلم سبعۃ ابحر — روایتھم لیست عن العلم خارجہ
فقل ھم عبید اللہ عروۃ قاسم — سعید ابوبکر سلیمان خارجہ

ان کے علاوہ ممتاز فقہا، کی بہت بڑی جماعت تھی، جن کے نام ہم طوالت کے خیال سے قلم انداز کرتے ہیں،

**رائے میں احتیاط**

فقہ کی بنیاد درحقیقت قرآن وحدیث ہی پر ہے، اور اسی اصول سے تمام مسائل مستنبط ہیں، لیکن نئے مسائل میں صاحبِ نظر مجتہد کو عقل ورائے سے کام لینا ناگزیر ہے، ورنہ فقہ کا دروازہ بند ہوجائے، لیکن تابعین کرام اس باب میں اتنے محتاط تھے، کہ مجتہدانہ نظر اور قیاس ورائے کی باوجود بغیر سند کے اپنی رائے کو دخل نہ دیتے تھے، بلکہ ان مسائل میں بھی جن کی سند موجود ہوتی، شدتِ احتیاط کی بنا پر جواب سے گریز کرتے تھے، ایوب بن ابی تمیمہ جو سید الفقہا کہلاتے تھے، اکثر مسائل کے جواب میں لاعلمی ظاہر کرتے تھے، جن مسائل کا جواب بھی دیتے تھے ان میں پہلے سائل کے فہم اور حافظہ کا پورا اطمینان کرلیتے تھے، بغیر سند کے اپنی رائے سے جواب نہ دیتے تھے[1] ربیعہ جیسے مجتہد جو اپنی قوت استنباط کیوجہ سے "رائی" کہلاتے تھے، اظہارِ رائے میں بڑے محتاط تھے، اور بغیر سند کے محض رائے سے جواب دینے کے مقابلہ میں جاہل مرجانے کو ترجیح دیتے تھے[2] امام شعبی اپنی جلالتِ شان کے باوجود فتووں کے جواب میں عموماً لاعلمی ظاہر کرتے تھے[3] اور بغیر سند کے کبھی جواب نہ دیتے تھے[4] عبد الرحمن ابن ابی لیلی بھی عموماً جواب دینے سے گریز کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلعم کے بیس انصاری اصحاب کو دیکھا ہے کہ ان میں سے ہر شخص جواب سے پہلو بچاتا تھا، اور چاہتا تھا کہ دوسرا شخص جواب دیدے، اور آج یہ حال ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے ہیں،[5]

عطا ابن ابی رباح کے پاس اگر کوئی سند نہ ہوتی، تو صاف جواب دیدیتے، کہ مجھے نہیں معلوم، ایک مرتبہ کسی مسئلہ کے جواب میں لاعلمی ظاہر کی، لوگوں نے کہا اپنی رائے سے جواب دیدیجئے، فرمایا مجھے خدا سے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۱۰، [2] تاریخ خطیب جلد ۸ ترجمہ ربیعہ رائی [3] ابن سعد جلد ۶ ص ۱۷۴، [4] ،، ص ۱۷۵، [5] ،، ص ۷۶،



سے شرم معلوم ہوتی ہے، کہ روئے زمین پر میری رائے کی اطاعت کیجائے[1] قاسم بن محمد بن ابی بکر جو مدینہ کے مشہور فقہائے سبعہ میں سے تھے، بغیر علم کے جواب نہ دیتے تھے، جو مسئلہ معلوم نہ ہوتا، بلاتکلف لاعلمی ظاہر کردیتے[2] قتادہ کسی مسئلہ میں رائے کو دخل نہ دیتے تھے، ایک مرتبہ کسی مسئلہ میں لاعلمی ظاہر کی، سائل نے کہا اپنی رائے بتا دیجئے، انھوں نے کہا کہ میں نے چالیس سال سے اپنی رائے سے کوئی جواب نہیں دیا ہے[3] ابن سیرین جو فقہ کے امام تھے، جواب سے اسقدر گھبراتے تھے کہ جب ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا، تو ان کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوجاتا[4] اور یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا، کہ تھوڑی دیر پہلے ہنس بول رہے تھے،

**رائے اور قیاس،**

اشخاص کی ذاتی احتیاط علیحدہ ایک شے ہے، لیکن اگر اصولی حیثیت سے رائے اور قیاس کا کوئی درجہ نہ رکھا جائے، تو پھر نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کی کوئی صورت باقی نہیں رہ جاتی، اس لئے عہد صحابہ میں بھی رائے وقیاس سے کام لیا جاتا ہے، خود آنحضرت صلعم نے اسکی تحسین فرمائی ہے، گو تابعین کی بڑی جماعت رائے کو احتیاط کے خلاف سمجھتی تھی، لیکن بہت سے تابعین ایسے تھے، جو رائے اور قیاس سے کام لیتے تھے، حضرت حسن بصری جن کی احتیاط اور جن کا زہد و ورع مسلّم ہے، رائے سے کام لیتے تھے، اور اسکی نہایت معقول توجیہ فرماتے تھے، ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا، کہ آپ جن جن مسئلوں کا جواب دیتے ہیں، کیا ان سب میں آپ کے پاس سماعی سند ہوتی ہے، فرمایا نہیں لیکن ہماری رائے سائلوں کی رائے سے زیادہ ان کے لئے بہتر ہوتی ہے[5] عطا بن ابی رباح بھی رائے سے کام لیتے تھے، اگر کسی سند پر کوئی مسئلہ بیان کرتے تو کہدیتے کہ اثر ہے، اور اگر رائے ہوتی تو ظاہر کردیتے کہ رائے ہے[6] قاسم بن محمد بن ابی بکر اگرچہ بڑے محتاط تھے اور بغیر سند کے کسی مسئلہ کا جواب نہ دیتے تھے، تاہم کبھی کبھی انھیں بھی رائے سے کام لینا پڑتا تھا، ایسے موقع پر وہ جواب دیکر یہ ظاہر کردیتے کہ "یہ میری رائے ہے یہ نہیں کہتا کہ حق ہے"[7]

---

[1] تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۲۰۲، [2] ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۹ [3] ،، جلد ۷ ق ۲ ص ۱ [4] ،، جلد ۷ ق اول ص ۱۴۲ [5] ،، جلد ۷ ق اول ص ۱۲۰ [6] ،، جلد ۵ ص ۳۴۵ [7] ،، ص ۱۳۹،

**قضاء کی استعداد و مہارت،** اگرچہ قضا، فقہ ہی کا ایک شعبہ ہے، لیکن اس میں فقہ کے علم کیساتھ بعض اور لوازم وشرائط کی ضرورت اور فطری صلاحیت واستعداد کو بھی دخل ہے، اس لئے ہر فقیہ میں قضاء کا ملکہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ تابعین کرام کی ایک معتد بہ جماعت اس فن میں بھی بصیرت رکھتی تھی،

جیسا کہ اوپر فقہ کے ذکر میں گذر چکا ہے، سعید بن مسیب رسول اللہ صلعم اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے فیصلوں کے بہت بڑے عالم اور واقفکار تھے، اسلئے قدرۃً ان میں قضاء کی مہارت زیادہ تھی، عبد الرحمن بن ابی لیلی فقہاء قضاۃ میں تھے، حجاج نے انھیں قاضی بنایا تھا[1] محمد بن سیرین قضاء میں اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم تھے[2] امام زہری میں بھی قضاء کا بڑا ملکہ تھا، عبد الملک نے انھیں دمشق کے عہدۂ قضاء پر ممتاز کیا تھا[3] یحیی بن سعید ابتداء میں مدینۃ الرسول کے قاضی تھے، پھر عباسی دور میں خلیفہ منصور نے انھیں بغداد کا قاضی القضاۃ بنایا[4] ابو بردہ بن ابی موسی کوفہ کی مسند قضاء پر تھے[5] ابو قلابہ جرمی کو قضاء میں خاص بصیرت تھی، ایوب کہا کرتے تھے کہ بصرہ میں ابو قلابہ سے زیادہ فیصلہ کی استعداد رکھنے والا کوئی نہ تھا، مسلم بن یسار کہتے تھے کہ اگر وہ عجم میں ہوتے، تو قاضی القضاۃ ہوتے[6] مسروق بن اجدع اموی دور میں کچھ دنوں قاضی رہے[7] ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے بھی تھوڑے عرصہ تک مدینۃ الرسول میں قضاوت کی[8] سعید بن جبیر قضاء میں بڑی بصیرت رکھتے تھے، اور کچھ دنوں تک کوفہ کے عہدۂ قضاء پر رہے، لیکن پھر بعض کوفیوں کی مخالفت کی وجہ سے انکی جگہ ابو بردہ کا تقرر عمل میں آیا، اور ابن جبیر انکے مشیر بنا دیئے گئے[9]،

جماعت تابعین میں سب سے نامور قاضی شریح اور ایاس بن معاویہ تھے، انھوں نے اس شعبہ کو بڑی ترقی دی، قضاء میں قانون کے علم کے ساتھ بہت کچھ فہم و فراست کو دخل ہے، ایاس اور شریح دونوں اپنے زمانہ

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۵۔ [2] ابن سعد جلد ۷، ق اول صفحہ ۱۴۳۔ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۵۱۔ [4] تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۱۲۲۔ [5] ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۱۰۰۔ [6] ” جلد ۷، ق اول صفحہ ۱۳۴۔ [7] ” جلد ۶ صفحہ ۵۵۔ [8] ” جلد ۵ صفحہ ۹۵۔ [9] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۴۴،



کے عاقل ترین انسانوں میں تھے، ایاس کے معاصرین کہتے تھے کہ ہر صدی میں ایک عاقل پیدا ہوتا ہے، اس صدی کے عاقل ایاس تھے[1] ابن سیرین انکو فہم و فراست کا بکر کہتے تھے[2] انکی قضائی فراست کے بہت سے واقعات ہیں، لیکن ہم طوالت کے خیال سے ان کو قلم انداز کرتے ہیں۔

قاضی شریح کا پایہ ان سے بھی بلند ہے، وہ تاریخ اسلام کے نامور قاضیوں میں ہیں، انھیں قضاء کی صلاحیت واستعداد فطری تھی، حضرت علیؓ جنھیں زبان رسالت سے اقضاھم علی کا لقب ملا تھا، شریح کو اقضی العرب "عرب کا سب سے بڑا قاضی" فرماتے تھے[3] ان کی اس صلاحیت کیوجہ سے لوگ انھیں شروع ہی سے مختلف فیہ معاملات میں حکم بناتے تھے، ان کے ایک فیصلہ کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کی جوہر شناس نگاہ نے انھیں قاضی بنا دیا، انھوں نے اپنی اہلیت کا ایسا ثبوت دیا کہ بڑے بڑے انقلابات میں بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے، اور حضرت عمرؓ کے زمانہ سے لیکر عبد الملک کے عہد تک مسلسل ساٹھ برس قاضی رہے[4]،

ان کے فیصلے علما کے لئے فقہ اور قضاء کا درس ہوتے تھے، اور بڑے بڑے علماء ان سے استفادہ کرنے کے لئے ان کی عدالت کی درسگاہ میں آتے تھے، عکرمہ کا بیان ہے، کہ میں معلومات حاصل کرنے کے لئے دو مہینے تک شریح کی عدالت میں جاتا رہا، ان کے فیصلے میرے معلومات کے لئے کافی ہوتے تھے[5]،

انھوں نے شعبۂ قضاء میں اپنے فطری ذوق واستعداد کی وجہ سے بڑی مفید ایجادیں اور اصلاحیں کیں، جو فن قضاء کے اصول میں داخل ہو گئیں، فن قضاء میں ان کے آئین اصول اور اختراعات کا موضوع نہایت دلچسپ ہے، لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے،

**فقہ کی تدوین اور فقہی مصنفات،** اگرچہ فقہ کی باقاعدہ تدوین ائمۂ اربعہ کے زمانہ میں ہوئی، لیکن اس کا آغاز عہد تابعین ہی سے ہو گیا تھا، اور ہم کو تابعین کی متعدد فقہی مصنفات کا پتہ چلتا ہے،

[1] تہذیب التہذیب جلد اول صفحہ ۳۹۰۔ [2] ” ”۔ [3] تہذیب الاسماء جلد اول ق اول صفحہ ۲۴۳۔ [4] ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۱۹۱۔ [5] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۶۴۔ [6] ابن سعد جلد ۶ صفحہ ۹۵

عروہ بن زبیر نے جو مدینہ کے سات مشہور فقہار میں سے ایک تھے، فقہ میں کئی کتابیں لکھی تھیں، لیکن پھر محض شدتِ احتیاط کی وجہ سے جلا ڈالیں[41] جسکا انہیں ہمیشہ افسوس رہا، چنانچہ فرمایا کرتے تھے، کہ کتاب اللہ کی موجودگی میں ہم لوگ دوسری کتاب نہیں لکھتے تھے، اس لئے میں نے اپنی کتابیں ضائع کر دیں، لیکن اب میری یہ خواہش ہے کہ کاش وہ میرے پاس ہوتیں، اور خدا کی کتاب اپنی جگہ پر قائم و دائم رہتی،[42]

مکحول دمشقی نے مستقل دو کتابیں کتاب السنن اور کتاب المسائل لکھیں تھیں،[43] امام زہری کے فتاوی تین مجلدات میں جمع کئے گئے تھے،[44] ان کے علاوہ اور متعدد تابعین نے کتابیں لکھیں تھیں لیکن انکے متعلق یہ تصریح نہیں ملتی کہ کس فن کے متعلق تھیں، اس لئے ان کا تذکرہ آخر میں آئے گا،

**علم فرائض،** فرائض کو بھی فقہ ہی کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے، اس میں بھی متعدد تابعین کمال رکھتے تھے، اعمش اس کے بڑے عالم تھے،[45] سعید بن جبیر فرائض کے اتنے بڑے ماہر تھے کہ صحابہ تک فرائض کے سائلین کو ان کے پاس بھیج دیتے تھے،[46] جب وہ مدینہ جاتے تھے، تو یہاں کے علما ان سے فرائض سیکھتے تھے،[47] حضرت زید بن ثابت فرائض کے بڑے عالم تھے، ان کے صاحبزادے خارجہ تابعی کو باپ کی اس وراثت سے وافر حصہ ملا تھا، چنانچہ مدینہ میں وہ اور طلحہ بن عبد اللہ تقسیم میراث کا کام کرتے تھے، اور اسکے وثیقے لکھتے تھے، اور اس میں ان کا قول سند مانا جاتا تھا،[48]

**مغازی اور سیرت کے ائمہ اور اس فن کی تصانیف** مغازی وسیرت (یعنی آنحضرت صلعم کی سیرۃ پاک اور آغاز اسلام کی لڑائیاں) یہ دونوں فنون تاریخی بھی ہیں، اور مذہبی بھی ابتدا میں ان فنون کی مستقل حیثیت نہ تھی، بلکہ حدیث کا ایک جزو تھے، لیکن تابعین نے اسکو مستقل فن بنا دیا، تابعین میں ابن شہاب

41 ابن سعد جلد ۵ ص ۱۳۳، 42 تہذیب التہذیب جلد ۷ ص ۱۸۳، 43 فہرست ابن ندیم ص ۳۱۸، 44 اعلام الموقعین جلد اول ص ۲۶، 45 تاریخ خطیب جلد ۹ ص ۱۲، 46 ابن سعد جلد ۲ ص ۱۸۱، 47 ... 48 تہذیب الاسما جلد اول ق اول ص ۱۷۳،



زہری سے پہلے اس فن کی مستقل حیثیت نہ تھی، سب سے پہلے انہی نے اسکی طرف توجہ کی، اور اسکو اتنی ترقی دی کہ مستقل فن بنا دیا، اور اس پر مستقل کتاب لکھی، سہیلی کے بیان کے مطابق یہ اس فن کی پہلی کتاب تھی،[49] ابن شہاب کے تلامذہ میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح، عبد الرحمن بن عبد العزیز، موسی بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے اس میں بڑا کمال پیدا کیا، ان آخر الذکر دونوں آدمیوں نے خصوصیت کے ساتھ بڑا نام پیدا کیا، یہ دونوں تابعی ہیں، اور اپنے عہد میں مغازی اور سیرت کے امام مانے جاتے تھے،[50] خطیب بغدادی کا بیان ہے، کہ ابن اسحاق پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس فن کی طرف توجہ کی، اور اسکو اتنی ترقی دی، کہ اس پر کوئی دوسرا اضافہ نہ کر سکا انھوں نے سلاطین اور امرا، کی توجہ بے نتیجہ اور لایعنی قصص و حکایات سے تاریخ کی جانب پھیر دی، اس طرح گویا انھوں نے سب سے پہلے تاریخ کا مذاق پیدا کیا،[51]

ابن عدی کا بیان ہے کہ اگر اس فضیلت کے علاوہ ابن اسحاق کی کوئی اور فضیلت نہ ہوتی، کہ انھوں نے سلاطین کا مذاق بدل دیا، اور انکی توجہ لاحاصل کتابوں سے رسول اللہ صلعم کے مغازی اور آغازِ عالم کی تاریخ کی جانب پھیر دی تو بھی یہ تنہا فضیلت کافی تھی، ان کے بعد بہت سے لوگوں نے اس فن پر کتابیں لکھیں، لیکن کوئی ان کے درجہ کو نہ پہنچ سکا،[52]

سیرت پر سب سے قدیم کتاب ابن اسحاق ہی کی سیرت تھی، یہ کتاب صدیوں سے ناپید ہے، لیکن اس کتاب سے اسکی روایات ابتک محفوظ ہیں، کہ ابن ہشام کی سیرت کا ماخذ یہی تھی، اس لیے اسکی تمام روایتیں اس میں محفوظ ہو گئی ہیں، جو ہمارے سامنے موجود ہے،

موسی بن عقبہ مدینہ میں مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے، انھوں نے بھی مغازی پر کتاب لکھی تھی، جو کتاب المغازی موسیٰ بن عقبہ" کے نام سے مشہور ہے، یہ کتاب اس زمانہ میں اس فن پر صحیح ترین کتاب مانی جاتی تھی،[53]

49 روض الانف، 50 تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۵۶، 51 تاریخ خطیب جلد اول، 52 تہذیب التہذیب جلد ۹ ص ۴۴، 53 ایضاً جلد ۱۰ ص ۳۶۱ و ۳۶۲،

بھی ناپید ہے، اس نام کی ایک کتاب برلن کے کتب خانہ میں ہے، جسکا ایک ٹکڑا ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا، انھوں[1]
نے کوئی قلمی یادگار نہیں چھوڑی، لیکن وہ بھی اس فن کے امام مانے جاتے تھے، جب مغازی بیان کرتے تھے
تو اپنی قوتِ گویائی سے میدانِ جنگ کا سماں باندھ دیتے تھے،[2] امام شعبی کی بھی کوئی قلمی یادگار نہیں ہے،
لیکن یہ بھی اپنے زمانہ میں مغازی کے امام تھے، اور صحابہ ان کے مغازی کے معترف تھے، حضرت عبداللہ
ابن عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اگرچہ میں خود مغازی میں شریک تھا، لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے، شعبی
مجھ سے زیادہ مغازی سے واقف ہیں، (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۶۶)

**تاریخ کی کتابیں۔** اگرچہ مغازی و سیرت بھی تاریخ ہی کی ایک قسم ہے، گو وہ مذہبی سہی، لیکن ان کے علاوہ تابعین
کرام تاریخ عام اور خالص تاریخ کے بھی عالم تھے، اور اس پر مستقل کتابیں لکھیں، خود ابنِ اسحاق تاریخ عام
یعنی لڑائیوں کی تاریخ آغازِ خلق کے حالات اور قصصِ انبیا کے عالم تھے،[3] مہدی کی فرمائش پر انھوں نے اس
کے لڑکے کے لئے ایک کتاب (خطیب کے بیان کے مطابق یہ سیرت تھی،) لکھی تھی، جس میں آغازِ خلق سے لیکر
ان کے زمانہ تک کے حالات تھے،[4] ابنِ ندیم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ انھوں نے تاریخ پر اور بھی
کتابیں لکھی تھیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں، وله من الكتب كتاب الخلفاء رواه عن الاموى كتاب السيرة
والمبتداء والمغازى،[5] ایک اور تابعی وہب بن منبہ نے سلاطینِ حمیر کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی
جس میں ان کے اخبار و قصص، ان کے قبور کے حالات اور انکے اشعار جمع کئے تھے، ابنِ خلکان نے یہ کتاب
دیکھی تھی، اور اسکو مفید بتایا ہے،[6] امیر معاویہ نے ایک تابعی عبید بن شریہ سے قدماء کی تاریخ اخبار الماضین لکھائی تھی[7]

**علم نحو۔** نحو ادب کی ایک شاخ ہے، اس کا مقصد زبانِ عربی کے تلفظ اور اس کے اعراب کی صحت ہے،
اسلئے ادب کی کتابوں کی تدوین سے برسوں پہلے نحو کا فن عالمِ وجود میں آگیا تھا، اس کا آغاز اس

۱ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ جرجی زیدان جلد ۲ ص ۱۵۰، ۲ تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۲۰۵، ۳ تاریخ خطیب جلد اول
ص ۲۱۵، ۴ ایضاً ص ۲۲۱، ۵ فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶، ۶ ابن خلکان جلد ۲ ص ۱۸۰، ۷ ابن ندیم ص ۱۳۲،



طرح ہوا کہ عہدِ صحابہ میں عجمی اقوام بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں، جو صحیح عربی نہیں پڑھ سکتی تھیں، اسلئے
انھیں عربی سکھانے کے لئے ایسے قواعد بنانے کی ضرورت پیش آئی، جنھیں سیکھنے کے بعد غیر عرب عربی
زبان صحیح پڑھ سکیں، چنانچہ اس کام کو ایک تابعی ابوالاسود دؤلی نے انجام دیا، یہ حضرت علیؓ کے تلامذہ
میں تھے، انھوں نے ابتدا میں چند نحوی مسائل قلمبند کئے، اس طرح فنِ نحو کی بنیاد پڑی، پھر ان سے
عنبسہ بن معدان، میمون بن اقرن، یحییٰ بن یعمر اور نصر بن عاصم متعدد آدمیوں نے یہ فن سیکھا،[1]

**غیر مذاہب اور ان کے صحیفوں کا علم۔** صحابہ کرام کی توجہ تمام تر قرآن کی جانب تھی، اس لئے وہ غیر مذاہب کے صحیفوں کی طرف
زیادہ متوجہ نہ ہوئے، تابعین کے زمانہ میں جب علمی ذوق نے وسعت حاصل کی تو ان کی توجہ ادھر بھی ہوئی،
چنانچہ متعدد تابعین غیر مذاہب کے صحیفوں کے عالم تھے، ان میں وہب بن منبہ خصوصیت کیساتھ لائقِ ذکر
ہیں، غیر مذاہب کے صحیفوں پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی، امام نووی لکھتے ہیں، کہ وہ گذشتہ کتابوں کے علم و
معرفت میں مشہور ہیں،[2] حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، اور اپنے زمانہ میں کعب احبار کی نظیر
مانے جاتے تھے،[3] انھوں نے بانوے[4] الہامی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، جن میں سے بعض بہت کمیاب تھیں، انکا خود
بیان ہے کہ بانوے[4] آسمانی کتابیں پڑھیں، ان میں سے ۷۲ کنیسوں اور لوگوں کے پاس موجود ہیں، اور بیس
کا علم بہت کم لوگوں کو ہے،[5] اگرچہ کعب احبار یہودی نو مسلم تھے، لیکن تھے وہ بھی تابعی، وہ اپنے مذہب کے بہت
بڑے عالم تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں، کہ وہ علم کا ظرف اور اہلِ کتاب کے علماء کبار میں تھے،[6] حضرت ابو درداء
انصاریؓ جن کا حمص میں کعب احبار کا ساتھ رہا تھا، فرماتے تھے، کہ ابنِ حمیریہ (کعب احبار) کے پاس بڑا علم ہے،[7]
تابعین میں ان کی بڑی علمی منزلت تھی، امام نووی لکھتے ہیں، کہ ان کے وفورِ علم اور توثیق پر سب کا اتفاق ہے
وہ اپنے وسعتِ علم کی وجہ سے "کعب الاحبار" اور "کعب حبر" کہلاتے تھے، اون کے مناقب بکثرت ہیں، اور ان کے

۱ فہرست ابن ندیم ص ۴۲، ۲ تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۱۴۹، ۳ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۹۰، ۴ ابنِ سعد جلد ۵
ص ۳۹۵، ۵ تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۴۵، ۶ ابن سعد جلد، ق ۲ ص ۱۵۶،

اقوال اور حکیمانہ مقولے مشہور ہیں[1]،

ان کے بعض صحابہ اور بہت سے تابعین نے یہودی مذہب کے متعلق معلومات حاصل کیے، تابعین میں مالک ابن ابی عامر، عطاء بن ابی رباح، عبد اللہ بن رباح انصاری، عبد اللہ بن ضمرہ، ابو رافع صائغ، عبد الرحمن ابن مغیث وغیرہ ایک بڑی جماعت ان سے مستفید ہوئی تھی[2]، اگر یہ بھی شمار کر لیے جائیں، تو غیر مذاہب سے واقف تابعین کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے،

**حلقہائے درس اور انکے علمی فیوض و برکات،**

تابعین نے جس ذوق اور محنت سے علم کی تحصیل کی اسی شوق اور فیاضی سے اسکو پھیلایا، اگرچہ اُس زمانہ میں آجکل کی طرح کوئی باقاعدہ نظام تعلیم نہ تھا، لیکن ہر شہر میں اکابر علماء کے حلقہائے درس ہوتے تھے، جن میں مذہبی اور غیر مذہبی جملہ علوم کی تعلیم ہوتی تھی، اور دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ کے تشنگان علم ان سرچشموں سے سیراب ہوتے تھے، اس دور کے جلیل القدر ائمہ اور اکابر علماء انہی حلقہائے درس کے فیضیافتہ تھے، ان میں سے ہم بعض کا تذکرہ کرتے ہیں،

مدینہ مدینۃ العلم تھا، اسلئے یہاں متعدد حلقۂ درس تھے، "ربیعہ رائی" کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، اس میں طلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، عام طلبہ کے علاوہ مدینہ کے علماء، عمائد اور بڑے بڑے شرفا شریک ہوتے تھے، اس حلقہ میں بیک وقت چالیس عمامہ پوش علماء کا شمار کیا گیا ہے[3]، امام مالک، امام اوزاعی، یحیی بن سعید انصاری اور شعبہ وغیرہ اکابر علماء اسی حلقۂ درس کے فیضیافتہ تھے،

حضرت عمرؓ کے غلام زید بن اسلم کا حلقۂ درس بھی نہایت وسیع تھا، ایک وقت میں چالیس چالیس فقہاء اس سے استفادہ کرتے تھے[4]، امام زین العابدین جیسے بزرگ اس حلقہ میں شریک ہوتے تھے، ایک مرتبہ نافع بن جبیر نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اپنی خاندانی مجلس کو چھوڑ کر ابن خطابؓ کے غلام

[1] تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۶۹، [2] تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۴۳۵، [3] تاریخ خطیب جلد ۸ ترجمہ ربیعہ رائی، [4] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶،



کے حلقہ میں شریک ہوتے ہیں، آپنے جواب دیا، آدمی اسی جگہ جاتا ہے، جہاں اسکو فائدہ پہنچتا ہے[1]، اس سے دو باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ مدینہ میں بنی ہاشم یا قریش کا کوئی خاص حلقۂ درس بھی تھا، دوسرے یہ کہ اکابر اور شرفا غلام سے استفادہ میں عار نہ کرتے تھے،

اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ایک زمانہ میں اہل مدینہ شان شرافت میں لونڈیوں کو ام ولد بنانا برا سمجھتے تھے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہوا، کہ انہی لونڈیوں کے بطن سے پیدا شدہ اشخاص علی بن حسین، قاسم بن محمد اور سالم بن عبد اللہ علم و تقوی اور زہد و عبادت میں بڑے بڑے بازی لے گئے، اسوقت سے یہ عار جاتا رہا[2]، عبد اللہ بن ذکوان کا حلقۂ درس اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے بادشاہوں کے دربار سے بڑھ کر تھا، اس میں مختلف علوم و فنون کے سیکڑوں طلبہ شریک ہوتے تھے، عبد ربہ بن سعید کا بیان ہے کہ میں نے ابو الزناد کو اس شان سے مسجد نبوی میں دیکھا ہے کہ ان کے ساتھ اتنا ہجوم تھا کہ بادشاہوں کو بھی نصیب نہ تھا، اس ہجوم میں فرائض، حساب، شعر، حدیث اور مختلف مشکلات اور علوم کے طلبہ اور سائلین تھے[3]، لیث بن سعد کا بیان ہے کہ میں نے ابو الزناد (عبد اللہ بن ذکوان) کے پیچھے مختلف علوم و فنون کے تین تین سو طالب علم دیکھے ہیں[4]،

قاسم بن محمد بن ابی بکر اور سالم بن عبد اللہ بن عمر کا حلقۂ درس بھی تھا، طلوع آفتاب کے بعد قاسم اس میں بیٹھتے تھے[5]، محمد بن عجلان کا حلقۂ درس مسجد نبوی میں تھا، اس میں بڑے بڑے تابعین شریک ہوتے تھے[6]،

مدینہ کے علاوہ دنیائے اسلام کے اور علمی مرکزوں میں بھی حلقہائے درس تھے، کوفہ میں عبد الرحمن ابن ابی لیلی کا حلقۂ درس نہایت ممتاز تھا، جس میں صحابہ شریک ہو کر سماع حدیث کرتے تھے[7]،

[1] تہذیب التہذیب جلد ۳ ص ۳۹۶، [2] رر ص ۴۳۷، [3] تہذیب الاسماء جلد اول ق ۲ ص ۲۳۳، [4] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۲۱، [5] ابن سعد جلد ۵ ص ۱۴۱، [6] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص ۱۴۹، [7] تہذیب التہذیب جلد ۶ ص ۲۶۱،

امام شعبی کا حلقہ درس صحابہ کرام کی موجودگی ہی میں قائم ہو گیا تھا،[1] دوسرا حلقہ درس مسجد کے کرام کا تھا، اس میں وہ معمولاتِ عبادت کے بعد بیٹھتے تھے، اور شائقینِ حدیث حلقہ باندھکر استفادہ کرتے تھے[2] حمص میں خالد بن معدان کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، یہ شہرت سے بہت گھبراتے تھے، اس لئے جب حلقہ زیادہ بڑھا، تو اٹھ گئے[3] یہ وہ حلقہائے درس ہیں جو سرسری مطالعہ سے نظر پڑ گئے، ورنہ زیادہ تلاش سے ایک ایک مقام پر متعدد حلقوں کا پتہ چل سکتا ہے،

**ذخیرۂ کتب۔** اوپر جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے علاوہ تابعین کی اور کتابوں بلکہ ذخیرۂ کتب کا پتہ چلتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کن کن فنون کی کتابیں تھیں، قیاس ہے کہ مذہبی علوم کے متعلق رہی ہوں گی حسن بصری کے پاس کتابوں کا ایک ذخیرہ تھا، جسے انھوں نے اپنی وفات کے وقت نذرِ آتش کرا دیا تھا،[4]

ابو قلابہ جرمی کے پاس ایک بار شتر کتابیں تھیں، ان کو انھوں نے اپنے مرض الموت میں ایوب سختیانی کو دیے جانے کی وصیت کی تھی،[5] ابن شہاب زہری کے پاس بھی کتابوں کا ذخیرہ تھا، ان کا علمی شغف و انہماک اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جب وہ گھر میں بیٹھتے تھے، تو ان کے اردگرد کتابیں ہوتی تھیں، اور وہ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتے تھے، ان کی بیوی کے لئے ان کا یہ انہماک سخت تکلیف دہ تھا، ایک مرتبہ انھوں نے جل کر کہا کہ ان کتابوں کا جلاپا تین سوتوں سے بڑھ کر ہے،[6] اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں اور علماء کے پاس بھی کتابوں کے ذخیرے ہوں گے،

———.———

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۷۰، [2] ابن سعد جلد ۶ ص۲۵۳، [3] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۸۱، [4] ابن سعد جلد ق اول ص۱۲۸، [5] تذکرۃ الحفاظ جلد اول ص۸۸، [6] ابن خلکان جلد اول ص۴۵۱،



# دیوان شمس تبریز اور مولینائے روم

از جناب غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے استاذ فارسی نظام کالج حیدرآباد

(۱۱)

**روزمرہ اور محاورہ کی کمی،** ہر چند اشعار کا حسن لفظی روزمرہ اور محاورہ پر منحصر نہیں، لیکن ان سے اکثر موقعوں پر شعر کے لفظی محاسن میں اضافہ ہو جاتا ہے، مولینا کے کلام میں یہ عنصر بھی غیر نمایاں ہے، سعدی اور حافظ کے ہاں انکی کثرت ہے جس سے ان کے کلام کا لفظی حُسن بڑھ گیا ہے، نظیری نے بھی اپنے کلام میں کثرت سے روزمرّہ اور محاورات باندھے ہیں، تغزلِ ظہوری بھی اس خصوص میں ممتاز ہے،

**جدتِ اسلوب کی کمی پیرایۂ ادا کی تکرار اور ان کے اسباب** اسکے علاوہ مولینا کے کلام میں بدیع الاسلوبی یا جدتِ اسلوب کی کمی ہے اسلیے پیرایۂ ادا کی تکرار پائی جاتی ہے اسکے برعکس سعدی اور خسرو اور حافظ جدتِ اسلوب کے مالک ہیں،

اسمیں کوئی شک نہیں کہ مولینا کے کلام میں شاعرانہ طرزِ ادا یا شاعرانہ بیان کے یہ نقائص پائے جاتے ہیں لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اسکی وجہ کیا ہے،

سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کبھی مولینا کو محض شاعری مقصود نہ تھی، بلکہ ان کا مقصود دین کی آواز پہنچانا تھا، اور چونکہ اس زمانہ میں لوگ شعر کے بہت دلدادہ تھے، شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، اس لئے انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے شعر کا پیرایہ اختیار کیا،

دیوانِ غزلیات میں آرٹ کے نقائص کی ایک اور خاص وجہ یہ ہے کہ مولانا نے اکثر غزلیات وجد اور مستی کی حالت میں لکھی ہیں، اور اپنے احوال کو الفاظ کی صورت دیدی ہے، ایسی حالت میں اشعار

میں زبان اور بیان پر غور کرنے کا کوئی موقع و محل بلکہ امکان ہی نہ تھا، چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جوشِ طبیعت اور محویتِ حال وخیال سے فرصت پا نا ان کے لئے ممکن نہ تھا،

عیب مکن گر غزل ابتر بماند　　　نیست وفا خاطر برندہ را،

اسلئے کثیر معنوی فضائل اور دیگر صوری محاسن کے مقابلہ میں یہ خفیف نقائص نظر انداز کر دینے چاہئیں، مولینا کی شاعری کے لئے کسی محفلِ مشاعرہ کی ضرورت نہیں، بلکہ انسان کی ضرورت ہے، کہ ان کا کلام تفریحی عناصر سے خالی ہے،

**عطار اور سنائی کا اثر،** مولینا اور ان کی شاعری پر حضرت عطارؒ اور حکیم سنائیؒ کے کلام کا اثر ہے، مولینا نے خود مثنوی اور دیوان میں اس کا تذکرہ کیا ہے، جسے ہم اوپر داخلی شہادت کے سلسلے میں درج کر چکے ہیں، علاوہ اس کے اس موضوع کے متعلق مناقب العارفین میں مولینا کا ایک ارشاد درج ہے جس سے عطار اور سنائی کے کلام سے ان کے تاثر کا اندازہ ہوتا ہے،

"فرمود ہر کہ سخنان عطار را بجد خواند، اسرار سنائی را فہم کند و باعتقاد تمام مطالعہ نماید کلام ما را ادراک کند و برخوردار شود و برخورد"[1]،

اس ارشاد سے صاف ظاہر ہے کہ مولینا اور عطار و سنائی کے کلام میں ایک معنوی ربط ہے،

**مولینا کے کلام پر خود انکی رائے** مولینا کی ضخیم مثنوی (جس میں تقریباً ساڑھے چھبیس ہزار اشعار ہیں،) اور ضخیم تر دیوان (جو تقریباً ۵۰ ہزار اشعار پر مشتمل ہے،) کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولینا شعر گوئی کی طرف بیحد مائل تھے، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے، اس کے ثبوت میں ہم بعض اہم ترین شہادتیں درج کرتے ہیں، جس سے معلوم ہو جائے گا، کہ ان کے منشاء اور سخن میں کیا ربط ہے، فیہ مافیہ کی عبارت ہے،

"آخر من تا این حد دل دارم کہ این یاران کہ نزدیک من می آیند، از بیم آنکہ ملول

[1] مناقب العارفین صفحہ ۲۰۶، مطبوعہ آگرہ،



ملول نہ شوند شعری گویم تا بدان مشغول شوند وگرنہ من کجا شعر از کجا، واللہ کہ من از شعر بیزارم و پیش من ازین بتر چیزے نیست، ہمچنان ست کہ یکے دست در شکنبہ کردہ است و می شوید برائے آرزوئے مہمان، چون اشتہائے مہمان بدانست مرا لازم شد، آخر آدمی بنگرد کہ خلق را در فلان شہر چہ کالا می باید آن خرد و آن فروشد اگر چہ دون ترین متاعہا باشد من تحصیلہا کردم در علوم و رنجہا بردم کہ نزد من فضلا و محققان و زیرکان آیند تا برائے ایشان چیزے غریب و نفیس و دقیق عرض کنم، حق تعالیٰ خود چنین خواست آن ہمہ علمہا را اینجا جمع کرد و آن سعیہا را اینجا آورد کہ من باین کار مشغول شوم چہ توانم کرد در ولایت ما از شاعری ننگتر کارے نبوذ، اما اگر در آن ولایت می ماندیم موافق طبع ایشان می زیستیم آن می ورزیدیم کہ ایشان خواستندے مثل درس گفتن و تصانیف کتب و تذکیر و زہد و عمل ظاہر ورزیدن"[1]،

مناقب میں مولینا کا ایک اور بیان درج ہے،

"مردم ایں ملک از عالم عشق مالک الملک و ذوق درون قوی بے خبر بودند... چنان مشاہدہ کردیم کہ بہیچ نوع بطرف حق مائل نبودند و از اسرار الٰہی محروم می ماندند بطریق لطائف سماع و شعر موزون کہ طبائع مردم را موافق افتادہ است، آن معانی را در خورد ایشان دادیم چہ مردم روم اہلِ طرب و زہرہ بیان بودند، مثلاً طفلے رنجور شود و از شربت طبیب نفرت نماید والبتہ فقاع خواہد طبیب حاذق دارو چنان نماید کہ دارو را در کوزہ فقاع کردہ بدو دہد، تا بوہم آن کہ فقاعست شربت برغبت نوشیدہ و از خلل علل صافی گشتہ حلل صحت در پوشیدہ مزاج سقیم مستقیم کند"[2]،

[1] مقدمہ فیہ مافیہ صفحہ ۳۲ [2] مناقب العارفین،

اپنے دیوان کی معنوی قدر و قیمت کے متعلق ان کا یہ خیال ہے،

آب حیات آمد سخن کآمد ز علم من لدن     جان را از و خالی مکن تا بر دہد اقبالہا

خموش شو کہ بے گفتی و کس نشنود     کہ ایں دہل ز چہ بام است ایں بیاز کجا

ع    گہر سفتم دریں دیواں کہ تا تو رستی از دیوان

اپنے کلام کے صوری نقائص کا ان کو پورا علم و احساس تھا، اس کے متعلق بے لاگ رائے اور صحیح وجہ ان کے پاس تھی، ان میں سے ایک شعر اوپر ہم نے عیوبِ شعر کی بحث میں درج کیا ہو یہاں اسکے علاوہ دوسرے اشعار درج کرتے ہیں،

تو ز لوحِ دل فرو خوان تمامی ایں غزل را     منگر تو از زبانم کہ لب و زبان نماند

حضرت شمس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہین،

شمس تبریز بجز عشق ز من ہیچ مجو     زان کسے دادِ سخن جو کہ سخندان باشد

**شیخ سعدیؒ کی قدر شناسی،** شیخ سعدی غزل کے بادشاہ ہیں، ان کے کلام میں شاعرانہ حسنِ خیال اور حسنِ بیان دونوں کی خوبیاں کماحقہ موجود ہیں، لیکن مولینا روم کی ذاتِ عالی صفات اور انکے کلام کی معنوی قدر و قیمت کا انھیں بہت احساس تھا، چنانچہ ملک شمس الدین حاکمِ شیراز کی ایک درخواست پر انھوں نے مولینا کی ایک غزل بھیجی، اور اس کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہین، اس سے ان کے دل میں مولینا کی عظمت اور ان کی شاعری کی قدر شناسی کا پورا اندازہ ہوتا ہے چنانچہ مناقب میں ہے،

"اصحابِ عظام روایت کردند کہ ملک شمس الدین ہندی کہ ملک ملک شیراز بود[1]، رقعۂ بخدمت اعذب الکلام الطف الانام شیخ سعدی علیہ الرحمہ و الغفران اصدار کردہ استدعا نمودہ کہ غزلی غریب کہ محتوی بر معانی عجیب باشد از ان ہر یک کہ باشد بفرستی تا غذائی جان خود سازم،

[1] والی یا حاکم تھا،



شیخ سعدی غزلِ نو از ان حضرت مولینا کہ دران ایام بشیراز بردہ بودند و خلق بکلی ربودہ آن شدہ نوشت و ارسال کرد و آن غزل اینست،

ہر نفس آواز عشق میرسد از چپ و راست     ما بفلک می رویم عزم تماشا کراست

در آخر رقعہ اعلام کرد کہ در اقلیم روم پادشاہے مبارک ظہور کردہ است و این از نفحات مرادست کہ ازین بہتر سخنے نہ گفتہ اند و نہ خواہند گفتن و مرا ہوس آنست کہ بزیارت سلطان بر یار روم روم و روئیم را بر خاک پائے او مالم"

**حضرت جامیؒ کی رائے،** حضرت مولینا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے مشہور اشعار میں مولانا کے کلام کی معنوی قدر و قیمت کا اعتراف فرمایا ہے، اگرچہ اس میں خاص طور پر ذکر مثنوی کا ہے لیکن یہ دیوان پر بھی صادق آتا ہے،

من چہ گویم وصفِ آن عالیجناب     نیست پیغمبر ولے دارد کتاب،

دولت شاہ اپنے مشہور تذکرہ میں مولینا کے کمال اور ان کے کلام کے متعلق لکھتا ہے،

"در تحصیلِ علوم یقینی عالم ربانی و در مراتبِ توحید و تحقیق سالک صمدانی است و رموز و اشاراتِ عالم غیب را بشیوۂ سخن گستری بیان کردہ و طریق عین الیقین را بواسطہ علم الیقین بعیان رسانیدہ"،

موج چون بر اوج زد آں بحر زخار از شرف
لولوئی منظوم بر ساحل فگند از ہر طرف،

**علامہ شبلی نعمانی کی رائے،** علامہ شبلی جو سخن فہمی میں خداداد ملکہ رکھتے تھے، مولانا کے کلام کے متعلق انکی رائے یہ ہے،

"مولانا کا فن شاعری نہ تھا، اس بنا پر ان کے کلام میں وہ روانی، برجستگی، نشست الفاظ،

حسنِ ترکیب نہیں پائی جاتی، جو اساتذہ شعراء کا خاص انداز ہے، اکثر جگہ غریب اور نامانوس الفاظ آجاتے ہیں، تکِ اضافت جو مذہبِ شعر میں کم از کم گناہ صغیرہ ہے، مولینا کے ہاں اس کثرت سے ہے، کہ طبیعت کو وحشت ہوتی ہے، تعقیدِ لفظی کی مثالیں بھی اکثر ملتی ہیں، تاہم سینکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ایسے بھی انکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، جن کی صفائی اور برجستگی اور دلآویزی کا جواب نہیں"

پروفیسر براؤن اور ڈاکٹر نکلسن کی رائے

پروفیسر براؤن آنجہانی جنھوں نے مدت العمر فارسی ادبیات کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور صاحبِ ذوق بھی تھے، مولینا کے دیوان کے سلسلہ میں ڈاکٹر نکلسن کی رائے سے اتفاق کیا ہے، جسے ہم آگے درج کرینگے،

ڈاکٹر نکلسن کو فارسی کے صوفیانہ ادب سے خاص دلچسپی ہے، خصوصاً مولینا روم کی تصانیف سے انکو بیحد لگاؤ ہے، مثنوی کے صحیح نسخہ کی ترتیب اور ترجمہ کے اہم فرائض بڑی خوش اسلوبی سے برابر انجام دے رہے ہیں، دیوان اور مثنوی کے فرق اور مشابہت پر ان کا یہ خیال ہے،

"ہم نے دیکھا ہے کہ فلسفۂ تصوف مولینا کی آمدِ طبع کا سرچشمہ ہے، اس سرچشمہ سے مثنوی اور دیوان دو نہریں الگ الگ جاری ہوئی ہیں، ایک کی شان بے پایاں دریا کی طرح ہے، ساکت وعمیق نہایت زرخیز، اور گوناگوں مرغزاروں سے گذرتی ہوئی اس سمندر میں جاگرتی ہے جس کی کوئی حد نہیں، دوسری نہر گویا ایک جوش مارتی ہوئی طوفان خیز موج ہے، جو اچھلتی کودتی ہوئی آبادی سے دور کہساروں میں جاکر جنگی لطافت عالمِ بالا سے چشمک زنی کرتی ہوئی غائب ہوجاتی ہے"،

(دیوان شمس تبریز مقدمہ از ڈاکٹر نکلسن)

مثنوی میں اخلاقی عنصر زیادہ ہے، دیوان میں صوفیانہ خیالات کے اظہار میں دلی کمال



کا نقطۂ نظر یا نصب العین پیشِ نظر ہے،

(مکتوب ڈاکٹر نکلسن بنام جناب ڈاکٹر نظام الدین صاحب صدر شعبۂ فارسی جامعۂ عثمانیہ)

علامہ اقبال کی رائے،

اس عہد کے مشہور اور معروف فلسفیوں اور شعراء میں ڈاکٹر اقبال مولینائے روم کے قدرشناس ہیں، یہ واقعہ ہے، کہ ان کی طبیعت اور ذوق کو مولینا سے بیحد مناسبت ہے، انہی کا قول ہے،

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی  برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

ان کے پیام اور کلام میں رومی کا اثر نمایاں ہے، اپنے تازہ ترین شاہکار جاوید نامہ میں ڈاکٹر اقبال نے عالمِ معنی کی سیر وسیاحت میں مولینا ہی کو راہنما بنایا ہے، اور اپنی تصانیف میں انھوں نے مولینا کے مسلک اور شاعری کے متعلق مختلف پیرایوں میں اظہارِ رائے کیا ہے، ہم ان اشعار کو یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ مولینا کی شاعری کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ ہوجائے،

مولینا کے کلام کی معنوی قدر وقیمت کے متعلق انکی رائے یہ ہے،

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد  سرِّ مرگِ زندگی برما کشاد

معنی از حرفِ او ہمی روید  صفتِ لالہ ہائے نعمانی،

نکتہ دانِ المنی را در ارم  صحبتے افتاد باپیرِ عجم

شاعرے کو ہمچو آں عالی جناب  نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

بوعلی اندر غبارِ ناقہ ماند،  دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

رازِ معنی مرشدِ رومی کشود  فکرِ من بر آستانش در سجود

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است  زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

باز بر خوانم ز فیضِ پیرِ روم / دفترِ سربستۂ اسرارِ علوم،

جانِ او از شعلہ ہا سرمایہ دار / من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد / از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحرِ او منزل کنم / تا درِ تابندۂ حاصل کنم

من کہ مستیہا ز صہبایش کنم
زندگانی از نفسہایش کنم

خود خود بنمود پیرِ حق سرشت / کو بحرفِ پہلوی قرآن نوشت

مولینا کے کلام کے حیات آفریں اثر کے متعلق ان کا بیان یہ ہے،

مطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور / تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزے

بیا کہ من ز خمِ پیرِ روم آوردم / مےِ سخن کہ جوان تر ز بادۂ عنبی است

شرارے جستہ گیر از درونم / کہ من مانند رومی گرم خونم

شعلہ در گیر و زد بر خس و خاشاکِ من / مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

جاوید نامہ ان کی جدید ترین تصنیف ہے، عوالمِ علویہ کی سیر میں مولینائے روم کو انھوں نے اپنا راہنما قرار دیا ہے، اس کتاب میں مختلف جگہ پر حضرت رومی کی شخصیت اور ان کے پیام کے مختلف پہلوؤں پر نظرِ غائر ڈالی ہے،

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید / از پسِ کہ پارۂ آمد پدید،

بر لبِ او سرِ پنہانِ وجود / بند ہائے حرف و صوت از خود کشود،

حرفِ او آئینۂ آویختہ / علم با سوزِ درون آویختہ

اجمالی ریویو، الحاصل مولینا کی شاعری متعدد خصوصیات خصوصاً معنوی قدر و قیمت کے نقطۂ نظر سے خاص حیثیت



رکھتی ہے، مولینا نے اپنی قوتِ فکر و شعر زیان کاری کو سود مندی اور مذموم کو محمود بنانے میں نہیں صرف کی،

انکی شاعری کا مقصد بت پرستی یا بت گری نہیں، ان کا یہ منشا نہیں کہ لوگوں پر افسردگی اور خستگی طاری ہو، اور حسنِ صداقت سے انکا ربط ٹوٹ جائے، لوگ غلط اندیشہ و فکر میں مبتلا ہو کر ذوقِ عمل سے محروم ہو جائیں، ان کے کلام سے غفلت میں اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ روحانی جمود دور ہوتا ہے، ان کی فریاد و نالہ سے "عشقِ مجبور" رسوا نہیں ہوتا، بلکہ "عشقِ غیور" کو سرخروئی حاصل ہوتی ہے، ان کے کلام کے مطالعہ سے یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا ذوق پیدا ہوتا ہے، ان کی شاعری افراد اور اقوام کی تعمیرِ خودی میں ممد و معاون ہے، ڈاکٹر اقبال نے اسرارِ خودی میں فکر و شعر کا جو معیار پیش کیا ہے، اس پر مولینا کی شاعری پوری اترتی ہے،

ہر شاعر کا کلام رطب و یابس کا مجموعہ ہوتا ہے، بقول ہیریسن ( Harrison ) کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے کلام کے بہترین حصہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جائے، اس نقطۂ نظر سے مولینا دنیا کے مشہور ترین شعراء کی صفِ اول میں ہیں، انکے فکر و شعر کی عظمت زمان و مکان کی قیود سے بلند تر ہے، انکی شاعری پر یہ قول صادق آتا ہے،

اہلِ دل را سینۂ سینا دہد
باہنرمندان یدِ بیضا دہد،

# مولانا کا مسلک تصوف یا فلسفۂ حیات

(دیوان کی روشنی مین)

لا الہ اے جان رہ الا اللہ است

ما ھم از لا تا بہ الا میرویم،

مسلک[1] تصوف اسکی بنیاد اور حقیقت کے متعلق مختلف طبقات میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں امتداد زمانہ سے پیدا ہوئین مستند اصحاب طریقت اور ارباب معرفت اس امر پر متفق ہیں، کہ تصوف اس سے زیادہ کچھ اور نہیں، کہ اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کیا جائے یعنی آپ کو ظاہر و باطن میں آیۂ کریمہ اخلصوا دینھم للہ کا مصداق بنایا جائے، خدا کی محبت میں محبوب خدا کی اتباع کیجائے تاکہ بارگاہ ربانی میں محبوب اور مقبول بندوں میں شمار ہو قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ قربانی اور نماز، زندگی اور موت خدا ہی کے لئے ہو، از آدم تا بہ خاتم الانبیا سارے انبیاء کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے (قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین،) مخلص متبعین اسی راہ پر چلتے رہے، اور چلتے ہیں، ہاں ایسا ہوا ہے کہ زمانہ کے اقتضاء اور ماحول کی ضرورت کے باعث تعلیمات اور اصول مختلف پیرایئے میں پیش کئے گئے، مثلاً جب مسلمانوں میں فلسفہ کا زور ہوا، اور اس مذاق نے اہل علم وفن کو گرویدہ کر لیا، تو حضرت شیخ اکبرؒ نے عقائد و اعمال کو فلسفیانہ تفکر کے انداز مین پیش کیا

[1] نفس تصوف کی حقیقت اور اس کا تاریخی انقلاب میرا اصل موضوع بحث نہیں، نہ یہ میری علمی تحقیق کے حدود میں ہے، میرا اصل موضوع بحث مولانا کے مسلک کے اصول ہیں، یہاں میں نے تمہیداً سرسری طور پر چند خیالات کا اظہار کیا ہے،



اور مختلف اصحاب نے اسکی پیروی کی، فصوص الحکم سے حجۃ اللہ البالغہ تک اسی کی مختلف صورتیں ہیں، اور جب شاعری کا ذوق عام ہوا، تو بعض اہل عرفان نے پیغام حقیقت پہنچانے کے لئے شاعری کو اپنا ذریعہ بنایا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے مختلف پیچیدگیاں ضرور پیدا ہوئین، لیکن حقیقت کبھی تبدل نہیں ہوئی، حقائق اور معارف اصول اور عقائد میں تبدیلی نہیں ہوئی، سنائی سے جامی تک یہی رنگ ہے شیخ سعدی نے باوجود اسکے کہ عشق حقیقی کا بیان پیرایۂ مجاز میں کیا ہے، فرماتے ہیں، ؎

مپندار سعدی کہ راہ صفا، توان رفت جز درپئے مصطفےٰؐ

جب مسلمانوں میں زوال کے آثار غالب ہوئے، تو بقول مولینا عبد الماجد ان کے دل و دماغ پر ایرانی تخیلات، یونانی توہمات اور ہندی مراسم کا اثر ہوا، انھوں نے ان چیزوں کو اپنے علم و عمل کا جزو لازم بنا لیا، غلط خیالات اور غلط کاری عام ہوئی، کثرت سے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوئے، ایمان گرفتار رسوم ہو گیا، شیوہ ہاے کافری کو وسعت مشرب سے تعبیر کیا گیا، قوالی اور پشمینہ پوشی اہل کمال کے لوازم قرار دئے گئے،

قوم ما از سحر این مسموم گشت خفت و از ذوق عمل محروم گشت،

ابتدا میں امام غزالی اور آخر میں حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے تجدید و اصلاح کا صور بڑے زور سے پھونکا، قلب سلیم رکھنے والے تو چونک گئے، لیکن غلط فہمی اور غفلت کا بالکلیہ ازالہ نہ ہوا، اس دور میں مستشرقین نے غلط فہمیوں میں اور اضافہ کیا، ایک تو وہ خود ان حقائق سے کماحقہ واقف نہ تھے دوسرے ہماری غلط نگاری اور غلط کاری نے انھیں بھی دھوکہ میں ڈالدیا، بعض نے بہت کچھ جاننے پہچاننے پڑھنے لکھنے کے بعد بھی غلط بیانی کی، انھوں نے کہا کہ دین اسلام تمام تر تقشف اور خوف کا مذہب ہے، تصوف سے جو مسلک محبت مراد ہے، اسکے عناصر دین اسلام میں نہیں ہیں، یہ عناصر اسلام میں عیسائیت سے داخل ہوئے ہیں، اسلام کا خدا توریت کا جبار و قہار خداوند تو ہو سکتا ہے لیکن

انجیل کا نہ ربان باپ وہ کبھی نہیں، یہی وہ مقام ہے، جہاں مستشرقین کے کمالِ علم اور تعصب کی حقیقت کھلتی ہے، تعصب نے انکی چشمِ بصیرت کو اندھا کر دیا ہے، غالباً وہ قرآن اور حدیث کو غلط بیانی کی نیت سے پڑھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں کوئی خاص حجاب اصل حقیقت پر نظر ڈالنے سے مانع ہوتا ہے، اور کتاب وسنت کے غالب حصہ کی تعلیمات پر انکی نظر ہی نہیں پڑتی، قرآن میں انھیں اسماءِ الٰہیہ میں سے قہار منتقم وغیرہ اسماءِ جلالیہ تو نظر آتے ہیں، لیکن رؤف، رحیم، ودود اور غفور وغیرہ جیسے اسماءِ جمالیہ اور ان اعتبارات کی آیات نظر ہی نہیں آتیں، انکو قرآن میں یہ کہیں نہیں دکھائی دیتا کہ خدا سے شدتِ محبت ہی کا نام ایمان ہے۔ الذین آمنوا اشد حباً للہ۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دینِ اسلام اتباعِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نام ہے، یہاں خدا کی محبت ہی شرطِ اتباع ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ بندہ محبوبِ خدا ہوتا ہے، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں محبت کے یہ اعتبارات بے شمار مواقع پر بیان کئے گئے ہیں، کہیں ان اللہ یحب المحسنین ہے کہیں ان اللہ یحب الصابرین ہے، اسکے مقابل ان اللہ لا یحب الظالمین، وغیرہ بھی ہے، اسلام میں اعمالِ خیر کی بنیاد بھی خدا کی محبت ہی ہے، یطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیماً و اسیرا، اکثر جدید تعلیمیافتہ حضرات پر جو نہ اپنے دین کے اسرار سے واقف ہیں، نہ غیروں کے دجل و مکر سے مستشرقین کا یہ جادو چل گیا ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کو فی الحقیقت اسلام سے کوئی تعلق نہیں، نہ معلوم تصوف سے ان کی کیا مراد ہوتی ہے، درانحالیکہ اصل تصوف ہی اسلام کی خالص اور پاکیزہ ترین تعبیر ہے،

غلط فہمیوں کے ان ظلمات سے نکلنے اور صداقت سے مستفید ہونیکا واحد طریقہ یہی ہے کہ کتاب و سنت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے، اسکے بعد سارے اکابر صوفیہ مثلاً شیخ ابو نصر سراج، شیخ علی بن عثمان ہجویری حضرت ابو القاسم قشیری خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی وغیرہ خصوصاً بانیانِ سلاسلِ صوفیا مثلاً محبوبِ ربانی حضرت شیخ جیلانی بانیٔ سلسلۂ عالیہ قادریہ حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی بانیٔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ حضرت شیخ شہاب الدین



بانیٔ سلسلۂ عالیہ سہروردیہ اور شیخ بہاء الدین نقشبند کے تصانیف ملفوظات اور تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے جس سے صاف معلوم ہو جائے گا، کہ تصوف کی حقیقت کیا ہے، اصل تصوف کسے کہتے ہیں، مردِ صوفی کون ہے، راہِ صفا کے کیا شرائط ہیں، سب سے بڑھکر یہ کہ تصوف اور کتاب وسنت میں کیا ربط ہے،

صوفیائے کرام اور اکابر اہلِ عرفان میں عارف رومی کو خاص اہمیت ہے انکا قول اس بارے میں مستند اور انکا بیان حجت ہے، اگر کوئی اس کا کامل اندازہ کرنا چاہے، کہ مولانا کے نزدیک تصوف کسے کہتے ہیں، اور صوفی کون ہے، اور مولانا کا مسلک کیا ہے، تو مثنوی معنوی اور فیہ ما فیہ یعنی حضرت کے ملفوظات کا مطالعہ کرے، حقیقتِ حال سے کاملاً باخبر ہو جائے گا،

لیکن ان کی تصانیف میں ایک دیوان بھی ہے، بقول مولانا عبد الماجد دریابادی ہر چند دیوان کسی ایک وقت کی مسلسل تصنیف نہیں، سالہا سال کی متفرق غزلوں کا مجموعہ ہے، اس سے کسی ایک متعین مسلک کا استنباط ممکن نہیں، کوئی غزل کسی حال کی شارح ہے اور کوئی کسی کیف کی، کیونکہ دیوان دورِ تلوین کی تصنیف ہے، دورِ تمکین کی نہیں، غزلیات مولانا نے اسوقت لکھے ہیں، جبکہ وہ صاحبِ حال تھے، صاحبِ مقام نہیں، دیوان میں زیادہ تر صوفیانہ جذبات اور متفرق احوال کی ترجمانی ہے، تعلیم و ارشاد اصول اور معارف مثنوی میں توضیح اور تصریح کیساتھ ہیں، یہ تصنیف دورِ تمکین کی ہے، یہ مولانا نے اسوقت لکھی ہے جب وہ صاحبِ مقام ہو گئے اور سالک نہیں بلکہ راہبر ٹھہرے اور تبلیغ و ہدایت پر مامور ہوئے،

لیکن پھر بھی دیوان اسی گلشن کا ایک پھول ہے، اور اسی بہار کا رنگ ہے، اس لئے اختلافِ حال کے باوجود ان میں وحدت کا ایک رشتہ ضرور ہے، چنانچہ انکے مسلک پر اجمالاً دیوان سے بھی روشنی پڑتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی اور ملفوظات سے اسکا اصولی اور معنوی اتحاد ہے، اسلئے یہ بیان مختصر ہوگا، صفحاتِ آیندہ میں ہمارا موضوعِ تحریر یہی ہے، اختصار کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ بعض مسائل جنکا مولانا کے مسلک اور فلسفۂ حیات سے گہرا تعلق ہے، باب سوم کے مہمات مضامین کے تحت زیرِ بحث آچکے ہیں، ذیل میں انکو ہم اشارۃً اور کنایۃً بیان کریں گے

(باقی)

# کلام لطف

## یعنی استاذ العلما مولٰنا مفتی محمد لطف اللہ صاحبؒ کا کلام

از

جناب مولوی محمد بدر الدین صاحب علوی استاذ ادبیات عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈہ

استاذ العلماء کے عنوان سے ایک بسیط مقالہ معارف اپریل ۱۹۲۳ء میں نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانی کے قلم سے نکلا تھا، جو بعد میں بصورتِ رسالہ علٰحدہ بھی شائع ہوا، مولینا ممدوح مستحقِ شکریہ ہیں، کہ انھون نے اس مقالہ کے ذریعہ سے ایک بڑی علمی خدمت انجام دی، فجزاھم اللہ تعالیٰ خیرا،

استاذ العلماء کی سوانحعمری نہایت بسیط مضمون ہے، جسپر بڑی ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے، اس کتاب کا ہر باب اخلاف کے لئے فیض رسان اور قابلِ تقلید ہوگا، اس وقت اس کا صرف ایک باب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، جو ان کی شاعری سے متعلق ہے، اگر خدا کو منظور ہے، تو ان کے مخصوص علمی کارنامو نکا باب بھی عنقریب پیش خدمت کیا جائے گا،

تمہید: اصل مضمون پر قلم اٹھانے سے قبل اپنے شفیق استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں سرشار ہو کر بعض جذبات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ

لابد للمصدور من أن ینفثا

حضرت کے انتقال کو بیس سال ہو گئے، جو واقعات کے بھول جانے کے لئے کافی مدت ہے، مگر اسوقت



بھی ان کی تقریرین اور کلمات کانوں میں گونج رہے ہیں، اور صورتِ مبارک نظرون کے سامنے ہے،

میرا زمانۂ تعلیم وہ تھا کہ جب حضرت نابینا اور معذور ہو کر درس باضابطہ بند فرما چکے تھے، میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں مجھ کو نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوئی، اور شرفِ تلمذ سے بہرہ ور ہوا، مجھسے اکثر فرمایا کرتے تھے، پڑھانا تو میری غذاے روح تھا،

اسی ذوق کا نتیجہ تھا کہ مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم جو فارسی اور تجوید کے استاذ تھے، باضابطہ درس کے زمانہ سے برابر پڑھتے چلے آتے تھے، ان کے درس کا سلسلہ حالتِ معذوری میں بھی جاری تھا، اور وہ اپنی پیرانہ سالی میں بھی شوق کی وجہ سے طالب علم بنے ہوئے تھے، ان کے دو سبق اس شان سے ہوتے تھے، کہ منگل اور جمعہ کو بھی تعطیل نہ ہوتی تھی،

میرے حاضر خدمت ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ مجھ کو مولوی اخلاق احمد صاحب مرحوم بھسوانی پڑھایا کرتے تھے، جب وہ علی گڈہ چھوڑ کر وطن جانے لگے، تو میرے اسباق کا انتظام زیر غور ہوا، بالآخر ان کی رائے ہوئی کہ میرے والد ماجد استاذ العلما کی خدمت میں حاضر ہو کر التماس کریں، کہ ایک سبق مجھکو حضرت پڑھا دیا کرین، والد مرحوم مولوی حافظ محمد عبد الرحیم صاحب وکیل علی گڈہ خود فارغ التحصیل عالم اور اپنے زمانہ کے مشاہیر اساتذہ مولینا فاروق صاحب چریاکوٹی، مولینا ہدایت اللہ خانصاحب رامپوری، مفتی یوسف صاحب فرنگی محلی اور مولانا معین الدین صاحب کڑوی کے شاگرد تھے، فرماتے تھے، میری طالبعلمی کے زمانہ میں استاذ العلماء کا علمِ شہرت لہرا رہا تھا، اور ان کے کمالات کے چرچون نے غائبانہ عقیدت ان کے ساتھ میرے دل میں قائم کر دی تھی، علی گڈہ آنے کے بعد یہ عقیدت نمایان ہو گئی، اور والد مرحوم استاذ العلماء کی خدمت میں شاگردون کی طرح حاضر ہونا اپنی سعادت سمجھتے رہے مولوی اخلاق احمد صاحب کی تجویز سنکر فرمایا کہ ایسی معذوری کی حالت میں مجکو التماس کرنیکی ہمت نہیں ہوتی ڈرتے ڈرتے مولوی صاحب مرحوم نے خود مجکو ساتھ لیجا کر التماس پیش کی، جو بہت کشادہ پیشانی کے ساتھ منظور ہوئی، اور حضرت نے مجھکو اپنی علمی آغوش

میں نے لیا، یہ سعادت خود ہی کیا کم تھی، اس پر سے یہ سند قبول بھی عطا ہوئی، کہ حضرت نے میرے بارہ میں یہ کلمات فرمائے :-

"میاں مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہیں، تو میں اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہوں اور جب تک انکو پڑھاتا رہتا ہوں ہائے ہائے سے نجات ملتی ہے" (ملاحظہ ہو رسالہ استاذ العلماء صـ۱۱)

یہ کلمات میرے لئے جسقدر بھی مایۂ ناز ہوں، بجا ہے، خوشا نصیب و زہے قسمت کہ مجھ حقیر اور ناچیز کے سبق کو حضرت نے اپنی تکلیفوں کے بھول جانے کا باعث اور ہائے ہائے سے نجات دینے کا سبب تصور فرمایا، فالحمد للہ علی ذالک۔ یہ سلسلۂ سعادت سات برس تک جاری رہا، شروع سے آخر تک جو شفقت مجھ پر فرماتے رہے، اس کا اظہار غیر ممکن ہے، اگر کسی وقت مجھ کو حاضر ہونے میں ذرا دیر ہو جاتی، تو فوراً خادم میرے دروازہ پر ہوتا، کہ میاں خیریت پوچھتے ہیں، اکثر اعزہ اور شاگردوں کے نام مجھ سے خطوط لکھواتے اور فرماتے کہ ہمارے حضرت مفتی (عنایت احمد) صاحب مجھسے خطوط لکھوایا کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے، کہ تم تو ہمارے نور چشم ہو"

استاذ العلماء کی شاعری اور نقد سخن، حضرت کے والد مولوی اسد اللہ صاحب اچھے شاعر تھے مضطر تخلص تھا، اخیر میں ضیق النفس کا عارضہ ہو گیا تھا، لیکن دورون کی شدید تکلیف میں بھی اشعار موزوں کیا کرتے، اون کے اشعار کبھی کبھی حضرت مجکو سنایا کرتے تھے، ایک واقعہ خود حضرت کا بیان فرمایا ہوا یاد آگیا، مولوی صاحب نے ایک غزل لکھی تھی، جسکے صرف تین شعر محفوظ رہگئے ہیں :-

لے اڑی طرز فغاں بلبل نالاں ہم سے — گل نے سیکھی روش چاک گریباں ہم سے
لاکھ روکا نہ رکا دیدۂ گریاں ہم سے — تو ہوا چاہتا ہے نوح کا طوفاں ہم سے
پاؤں پھیلائے تو ہی رہنما ہیں آئے بلبل — چھوٹتا ہے کوئی دم میں یہ گلستاں ہم سے

یہ غزل کسی نے مرزا غالب کو سنائی، بہت پسند آئی، پوچھا کس کی ہے، سنانے والے نے کہا کہ گوں



میں ایک مولوی اسد اللہ ہیں، مرزا نے کہا کیوں نہ ہو یہ نام کا کمال ہے، (مرزا کا نام بھی اسد اللہ تھا)

استاذ العلماء کی شاعری میرے نزدیک میراث پدری تھی، اوائل عمر ہی میں شعر گوئی کا ذوق ہوا ہوگا، لیکن خدا نے ان کو پیدا تو دوسرے کام کے لئے کیا تھا اس لئے دولت علم سے مالا مال ہو کر دریا فیض جاری کیا، اور اخیر تک اسی کے اجراء میں مصروف رہے، ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ حضرت کی شاعری کوئی باضابطہ شاعری نہ تھی، اگر کسی وقت طبیعت شگفتہ ہوئی، تو کچھ اشعار موزوں ہو گئے تاریخیں کبھی خود نظم فرمائیں، کبھی کسی کی درخواست پر، کسی وقت دل چاہا، تو کسی شاگرد کو منظوم خط لکھدیا، یہ کیفیت اسوقت کی ہے، جب درس میں انہماک تھا، اس سے قبل یعنی اوائل عمر کا یا محض فارسی کی تکمیل کے بعد کا کلام بھی ہے،

کلام زیادہ تر فارسی ہے، کچھ اردو میں بھی ہے، عربی میں بجز ایک تاریخ کے کوئی اور چیز نہیں ہے، غالباً اسکی وجہ یہ ہوگی، کہ فارسی تعلیم کے بعد ذوق کا میلان فارسی میں راسخ ہو گیا، اور پھر رخ نہ بدلا، فارسی اور اردو دونوں میں کہیں کہیں ذرہ اور کہیں لطف تخلص فرماتے تھے،

شعر گوئی کے مذاق کے ساتھ حضرت بڑے نقاد سخن تھے، اور شاعری کا پورا ذوق تھا، مولینا نزدانی نے بالکل صحیح لکھا ہے، (میں نے اپنے زمانہ میں بھی یہی مشاہدہ کیا)

"خاص صحبتوں میں اشعار کا ذکر چھڑ جاتا تو گھڑیوں جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اردو ادب سے یکساں ذوق تھا" (رسالہ استاذ العلماء صـ۱۹)

ایسے نقاد سخن کے کلام میں جتنی خصوصیات اور خوبیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب حضرت کے کلام میں موجود ہیں، جو فصاحت و بلاغت سلاست و روانی اور بے تکلفی اور آمد ہے، وہ ناظرین کو آئندہ نمونوں سے خود معلوم ہو جائے گی، سارے کلام میں استادانہ انداز نمایاں ہے،

# فارسی کلام

اس زمانہ کے عام دستور کے مطابق حضرت مرحوم کا اصل ذوقِ سخن فارسی میں تھا، آپ نے فارسی کے بیشتر اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرمائی ہے اور ہر صنف کے نمونے آپ کے کلام میں موجود ہیں جو بلا تامل اہلِ زبان کے کلام کے پہلو بہ پہلو رکھے جاسکتے ہیں، ہر صنف کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں

مناجات باری تعالیٰ،

بجنابِ تو خداوندِ دو عالم نالم ۔ زان کہ جز تو نرسد ہیچ بدادِ عالم

برمنِ زار بہ بخشای کہ از جورِ سپہر ۔ سخت شوریدہ سر و طرفہ کسیر البالم

مگر این چرخِ جفا پیشہ بے جت و نیافت ۔ از پئے مشقِ ستم جز تنِ من در عالم

رحم کن رحم خداوند کہ از غایتِ غم ۔ می رود از کفِ من دامنِ استقلالم

بطفیلِ شہِ کونین رسولِ عربیؐ ۔ آنکہ باشد بفدائش دل و جانؐ مالم

آنکہ وصفش شدہ بیرون ز حد وہم قیاس ۔ زانکہ در مدحتِ او الکن و گنگؐ لالم

وار ہانم ز غم و غصہ چنانم کہ بقہر ۔ چرخ را لت زنم و گوشِ عدو رامالم

نعت رسول صلعم؛

حبیبے را کہ احمد نام کردند، ۔ شرابِ عشقِ او در جام کردند

کسے کو گشت زاں صہباسیہ مست ۔ مقامش برتر از اوہام کردند،

ز گیسو ہائے عنبر بوئے جانان ۔ برائے صید دلہا دام کردند

سوادِ جانفزو زلیۃ القدر ۔ ز چشم سرمہ سائش وام کردند

ز جود حق مشو اے لطف نومید ۔ کہ نامش مفضل و منعام کردند،



رنگِ تغزل:۔

اے صبا راست بگو آن بتِ گلفام کجاست ۔ آن پری چہرہ کہ سلمیٰ بودش نام کجاست

آن چناں رفتہ ام از خویش بعشقِ آن ماہ ۔ کہ نہ دانم کہ سحر ہست کجا شام کجاست

من بیادِ رخِ او سوختم و حیف کہ گاہ ۔ او نہ پرسید کہ آن عاشقِ ناکام کجاست

وقفِ صد رنج و غمستم تا بوجود آمدہ ام ۔ من نہ دانم چہ طرب باشد و آرام کجاست

ساقیا ما ز مئے عشقِ صنم مدہوشیم ۔ ما چہ دانیم کہ مینا ست کجا جام کجاست

ذرّہ از سادگیِ خویش در افتاد بہ بند
این نہ دانست کہ صیاد کجا دام کجاست

من عاشقِ روئے توام شیدائے گیسوئے توام ۔ افتادہ در کوئے توام بنگر بسویم از کرم

دلدادہ و دیوانہ ام حسنِ ترا پروانہ ام ۔ از خویشتم بیگانہ ام رحمی بحالم اے صنم

اے جانِ من جانانِ من اے نازنیں نازک بدن ۔ اے دلبرِ سیمیں ذقن از دوریت جان بر لبم

در عشقِ تو اے مہ لقا ہستم گرفتارِ بلا، ۔ رفت است خواب از دیدہ ہا ہمسایہ "از یاربم"

اے من بلا گردانِ تو جان و دلم قربانِ تو ۔ تا چند از ہجرانِ تو باشم اسیرِ رنج و غم

جان در ہوایت باختم دل صیدِ نازت ساختم
ہم شمع ساں بگداختم از آتشِ حسنت منم

بیا جاناں بیا اے آنکہ جانِ من فدائے تو ۔ بحالِ زارِ من بنگر کہ چونم در ہوائے تو

چہ خوش باشد اگر باشی تو اے جاناں برائے من ۔ زہے قسمت اگر من اے صنم باشم برائے تو

بگوشم ایں صدا می آید از ہمسایگان ہر دم ۔ کہ اے ذرّہ بجاں آیم ما از ہائے ہائے تو

سرت گردم دمے شادم ز وصلت کن کہ ہستم من ۔ اسیرِ دامِ زلفت بسملِ تیغِ ادائے تو،

کہاں جاؤں کہوں کس سے جو کچھ دل پر گذرتا ہے
مگر پیش تو نالم اے صنم از جور ہاے تو

مضیٰ عمری و یمضی ما بقی فی فرقۃ سلمیٰ

رضینا بالقضا یا رب اگر ہست این رضاے تو

عالمے بہر تماشاے تو گرد آمدہ است | وہ چہ روے عجبے قابل دیدن داری
ہیچگہ بے نتوانی کہ روی از دل من | اے کہ از دیدۂ من قصدِ رمیدن داری
قصہ بے سر و سامانی خود شرح دہم | بحضورِ تو اگر تابِ شنیدن داری

اے صبا گر گذری سوے صنم فاش بگو،

عاشقے بر سرِ رہ گرم تپیدن داری

قطعات و رباعیات:-

اے گوہرِ درجِ خوبروئی زود آ | وے شمعِ شبستانِ نکوئی زود آ،
جانم ز فراقِ تو رسیدست بلب | اے آنکہ مرا توی آرزوئی زود آ،

---

بگوے دوست برد اضطرابِ دل مارا | کہ تا ز دور ببینم جمالِ سلمیٰ را،
کشش بمن و باز دوریش عجب ست | نہ کرد ہیچ کسے حل مرایں معما را،

---

ایں خانۂ دل کہ خانہ بس عالی ست | اے عشق بیا کہ از برایت خالی ست،
آب از چشم و کباب از سینہ بجوے، | وز آہ ہوا کہ مثمر خوش حالی ست،

---

من شیفتہ روے نکویت ہستم، | دلدادۂ زلفِ مشکبویت ہستم
ہر چند بظاہر از تو دوری دارم | اما بخیال روبرویت ہستم،

قطعات تاریخ:-

تاریخ تولد دختر محمد ابراہیم خان رامپوری،



خدا بخشید ابراہیم خان را | نکو دختر بوقتِ نیک مسعود،
سروشے از پئے سالِ ولادت | نکو بخت و نکو طالع بفرمود،
۱۲۷۰

تاریخ ولادت عبد الرشید خان پسر نواب[۱] عبد العزیز خان بریلوی،

حق بعبد العزیز خان بخشید، | پسر نیک صورت و سیرت،
ہاتفے گفت از پئے تاریخ، | مہر اوج سعادت و عزت،
۱۲۶۳

مفتی عنایت احمد صاحبؒ جب جزیرہ شور سے رہائی پاکر واپس آئے تو استاذ العلماء ان سے ملنے کاکوری تشریف لے گئے، اور وہاں یہ تاریخ پیشِ خدمت کی،

چون بفضلِ خالق ارض و سما | اوستادم شد ز قیدِ غم رہا،
بہر تاریخ خلاص آنجناب | بر نوشتم انّ استاذی نجا
۱۲۷۷

تاریخ وفات حافظ[۲] عبد الرشید کولوی،

رفت عبد الرشید ازیں عالم، | باد از حق دراہتیا خلد،
ہاتفے گفت سال رحلتِ او، | جاے عبد الرشید باد اخلد،
۱۲۷۷

تاریخ وفات حکیم احمد بخش پلکھنوی،

---

[۱] نواب عبد العزیز خان والی روہیلکھنڈ نواب حافظ الملک کے پوتے تھے، مفتی عنایت احمد صاحب کے قیام بریلی کے زمانہ میں ان کی شاگردی میں داخل ہوئے، استاذ العلماء سے اوسی زمانہ میں ملاقات اور دوستی ہوئی، نواب عبد العزیز خاں اردو کے شاعر بھی تھے، ان کا دیوان عزیزی طبع ہوچکا ہے، عبد الرشید خان نے (جن کی یہ تاریخ ولادت ہے) ۱۳۴۷ھ میں انتقال کیا، ملاحظہ ہو حیات حافظ رحمت خاں مطبوعہ بدایون صفحہ ۳۲۵،

[۲] حافظ عبد الرشید کا کولوی سے کیا تعلق تھا، اسکا کچھ پتہ نہیں چلا،

چون حکیم حاذق احمد بخش نام
رخت بستہ زین جہان تنگنائے،

بہر تاریخ وفاتش ہاتفے
گفت واویلا دریغا ہائے ہائے

۱۳۰۱

مراثی:-

مرثیہ حکیم اکرام اللہ صاحب[1]،

اے عم مکرمم کجائی،
پنہان ز نگاہ من چرائی،

آن صورت انور تو اے عم
یکدم نرود ز چشم پرنم،

اے عم ز غم تو زار و نالم
بنگر کہ کجا رسید حالم

اے وائے ز ما چہ جان بریدی
در دہرہ تو خوابگہ گزیدی

از لکھنؤ تا بہ دہرہ دون آہ،
صد مرحلہ ہست درمیان راہ

چون بہر زیارت تو آیم،
چوں گام بسوے تو کشایم

ارضاك الله بالنعيم
والفضل الدائم الجسيم

## اردو کلام

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، آپ کا اصل میدان فارسی تھا، لیکن کبھی کبھی تفنن طبع کے طور پر اردو میں بھی فکر فرماتے تھے، اسی لئے اردو کا کلام مختصر ہے تاہم جس قدر ہے، وہ لطف سے خالی نہیں، نمونے ملاحظہ ہوں،

نعت رسول صلعم:-

ہو تیرا بھلا ساقی اک جام ہمیں بھر دے
یہ تجھ ہی سے ہوویگا ہر کارے و ہر مردے

[1] حکیم صاحب موصوف استاذ العلماء کے حقیقی چچا تھے، دہرہ دون میں کسی انگریز کے ملازم تھے، وہیں ۱۱ر جولائی [illegible] کو انتقال کیا،



ہو دور پریشانی جاتی رہے حیرانی
میری بھی طرف گر وہ رحمت کی نظر کر دے

وہ سب بہادر ہے، جو شوق شہادت میں
سر اپنا تہ تیغ ابروے بتاں دھر دے

کون اس سے عیاں تر ہے ہر جا وہی ظاہر ہے
سب حال یہ کھل جائیں اٹھ جائیں اگر پردے

یا ختم رسل رحمے کز جور فلک دارم
ہم دیدہ پر از اشکے ہم سینہ پر از درد ے

فرقت میں مدینہ کی اے لطف تڑپتا ہوں
اک آن میں اڑ جاؤں خالق جو مجھے پر دے

رنگ تغزل:-

کبھی ہم پر وہ مہربان نہ ہوا
کبھی دل اپنا شادمان نہ ہوا،

کس لئے مجھ سے بدگمان ہو تم
میں کبھی تم سے بدگمان نہ ہوا،

اندر اندر ہی سینہ کے دل زار
جل گیا پر کبھی دھواں نہ ہوا،

عاشقی میں ہوا ہوں افسانہ
ذکر میرا کہاں کہاں نہ ہوا،

فکر کیا کیا نہ کی چھپانے کی
حال دل کا مگر نہاں نہ ہوا،

دیکھتا میری بے قراری کو
آہ اس وقت وہ یہاں نہ ہوا،

یہی حسرت ہے مجکو اے ذرہ
کہ میرے گھر وہ میہمان نہ ہوا،

---

غم عشق بتاں ہے اور میں ہوں
دل ناشادماں ہے، اور میں ہوں

نہیں تھمتے شب فرقت میں آنسو
یہ دریاے رواں ہے اور میں ہوں

شب تار فراق و دل ربا میں،
قلق ہے اور فغاں ہے اور میں ہوں

کہاں قسمت کہ پہونچوں اسکے در تک
فراق جان جاں ہے اور میں ہوں

فلک سے کب توقع ہے وفا کی
جفاے آسماں ہے اور میں ہوں

کوئی قصہ نہیں مجکو خوش آتا
صنم کی داستاں ہے اور میں ہوں

چو دیدم آن چشم سرمہ گینش روان شدہ سیلِ خون زدیدہ

سجن کی آنکھوں نے مجکو مارا دہائی ساری خدائی کی ہے،

نہ نامۂ سوے من فرستد نہ پرسد از من چہ حال دارد

کوئی یہ پیارے سے جاکے پوچھے کہ ایسی کیا میں[۱] برائی کی ہے،

ز اہلِ عالم بحالِ زارم کسے ترحم نہ کرد باآن کہ،

پھرا ہوں روتا گلی گلی میں نگر نگر میں دہائی کی ہے،

حدیث دلبر رود بہر جا باستماعش شوم ہمہ گوش،

سلون نہ کیونکر میں اس کی بتیاں کہ جینے من میں سمائی کی ہے،

قطعات و رباعیات :-

مرے دل سے جاتی نہیں یاد تیری
خبر جلد لے آکے اے یار میری

مصیبت ہے اے یار تیری جدائی
مجھے کھائے جاتی ہیں راتیں اندھیری

---

پوچھتے ہو کیا ہو حال کیسا ہے،
صاف ظاہر ہے حال جیسا ہے،

چشم سے اشک ہیں رواں ہر دم
لب پہ نالہ ہے، حال ایسا ہے،

---

اے گوہرِ درجِ خوبروئی
شمعِ کاشانہ نکوئی

فرقت میں ترے نزار ہوں میں
بیخواب و بیقرار ہوں میں

ہوتی ہے بری وہ آشنائی
ہو جس سے ملی ہوئی جدائی

دل لگتا نہیں ہو گھر میں میرا
جنگل میں کرونگا جا بسیرا

[۱] یہ قطعہ بھی نو عمری کا معلوم ہوتا ہے، اس میں نے برائی کی ہے کے بجائے میں برائی کی ہے استعمال کیا، اس قسم کے محاورے قدیم اردو میں مستعمل تھے،



قطعات تاریخ :-

جب مفتی عنایت احمد صاحب جزیرہ شور سے واپس ہو کر کاکوری تشریف لائے، تو استاذ العلما کو اپنے استاد کی قدمبوسی کا اشتیاق پیدا ہوا، اور ذیل کی رباعی لکھکر ان کی خدمت میں بھیجی،

بہلاؤں کہاں تک دلِ ناشاد کو میں
کب تک کروں ضبط آہ و فریاد کو میں

انشاء اللہ ایک ہفتہ کے بعد،
آتا ہوں قدمبوسیٔ استاد کو میں
۱۲۷۷

تاریخ تولد فرزند،

ہوا پیدا جو یہ فرزندِ دلبند
خوشی کی پھر گئی ہر سو منادی

مجھے تھی فکرِ تاریخِ ولادت
نکو اختر ہے ہاتف نے ندا دی
۱۲۹۲

تاریخ وفات مولانا عبد الحئی صاحب فرنگی محلی،

فاضلِ بے نظیر عبد الحئی
مہرِ اوجِ علا چراغِ ہند

ذات سے جن کی تھا یہ ہند کو فخر
عرشِ اعلیٰ پہ تھا دماغِ ہند

آہ دنیا سے کر گئے وہ سفر
چلی بادِ خزاں بباغِ ہند

تیرگی چھا گئی نگاہوں میں،
غم سے پر ہو گیا ایاغِ ہند

فکرِ تاریخ تھی کہ ہاتف نے
دی ندا بجھ گیا چراغِ ہند
۱۳۰۴

مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ تکمیل علوم کی تاریخ،

جلسۂ تکمیل میں طالبوں کا ازدحام
دیکھ کہا عقل نے مدرسہ فیض عام
۱۳۱۰ھ

اپنے ہم زلف قاضی فضل علی کو برجستہ یہ مصرعہ خط میں، لکھا جو واقعہ ہونے کیساتھ تاریخ پر بھی مشتمل ہے،

خوب بارش ہوئی ہے اب کی سال
۱۲۷۱

---

## عربی کلام کا نمونہ

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ عربی شاعری کی جانب آپ کا میلان نہ تھا تاہم اس پر پوری قدرت تھی، نمونہ کے لئے مولوی جمیل الدین فرخ آبادی متخلص بجمیلؔ کی تاریخ وفات پیش کیجاتی ہے،

علام العصر عارف الدہر ذو الفضل الکامل العظیم
اعنی شمس الھدی جمیلا مداح نبینا الکریم
ان الرحمن قد توفاہ بالرفق الناعم الجسیم
ارخت وفاتہ بقولی ارضاہ اللہ بالنعیم
۱۲۷۶

## شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کیساتھ تمام مشہور شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، مطبوعہ معارف پریس،

| | | |
|---|---|---|
| حصہ اول | (عباسی مروزی سے نظامی تک،) | ضخامت ۳۵۰ صفحے قیمت عاِر |
| حصہ دوم | (خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ اور ابن یمین تک) | ر ر ۳۰۲ ر ر عاِر |
| حصہ سوم | (فغانی سے ابو طالب کلیم تک،) | ر ر ۲۳۰ ر ر عاِر |
| حصہ چہارم | (شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی پر تبصرہ) | ر ر ۲۳۶ ر ر عاِر |
| حصہ پنجم | (قصیدہ، غزل اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ) | ر ر ۲۲۸ ر ر عاِر |

قیمت پورے سٹ کی، عللعہ
"منیجر"



# مذاہب اربعہ میں فطرت کا لگاؤ

از

جناب ہوش بلگرامی (حیدرآباد دکن)

یہ وہ دعوی ہے، اجسے دائی ایم، سی، اے (حیدرآباد دکن،) کے ایک جلسہ میں بعض محترم اور قابل بزرگوں نے مذاہبِ عالم کے متعلق (غالباً اپنے روادارانہ نقطۂ نظر کا اظہار فرمانے کے لئے) پیش کیا ہے، اور اسکی کوشش کی ہے کہ ان مذاہبِ اربعہ (برہمنزم، بودہ مت، عیسائیت اور اسلام) کے مابین (فاضل مقرر کی رائے میں) جو فطری یگانگت قائم ہے، اس سے ایسے دلوں کو روشناس کرایا جائے، جو ادیان و ملل کے بنیادی اصول سے ناواقف ہوں،

مذہب کے بارہ میں ہر انسان کا نقطۂ نظر ہمیشہ سے جداگانہ رہا ہے، اور ہر شخص نے اپنی اپنی عقل کی رہبری میں مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، با ایں ہمہ حقیقت اپنی جگہ ایک ہی رہی ہے اور غالباً اسی کو حاصل کرنے کی کوششیں کیجارہی ہیں، جو اسلئے اکثر ناکام اور ناتمام ثابت ہوئی ہیں، کہ کسی نے بھی اپنے اپنے ایقان و عقائد سے ہٹ کر کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں کی ہے، اسلئے جو کچھ میں عرض کرونگا، وہ میرے ایسے خیالات ہیں جنھیں میں نے مذہب کے ہر زاویہ سے دور رہ کر صرف ایک انسان ہونے کی حیثیت سے سوچا اور سمجھا ہے،

مذاہب کا مسئلہ نازک بھی ہے، اور آسان بھی، لیکن جب کبھی فلسفیانہ نکتہ سرائیوں سے کام لیا گیا ہے تو مذہب کے عام فہم اصول بھی ایک چیستاں بنکر رہ گئے ہیں، ایسی چیستان جسے بوجھنے کے لئے

ذہنِ انسانی کو نہ جانے کن کن بھول بھلیوں سے گذرنے کی ضرورت پیش آتی ہے،

سب جانتے اور مانتے ہین، کہ مذاہبِ عالم کی بنیاد نیکی و نیکو کرداری پر رکھی گئی ہے، لیکن یہ تعلق فطری آویزش کے لئے کیونکر کافی ہو سکتا ہے، جب کہ مذہب کا فرض صرف عمران و تمدن پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ مذہب، کائنات یا تخلیقِ کائنات کے سلسلہ کی وہ کڑی ہے، جو بندہ کو خدا سے ملاتی، اس پر نیکیون کے دروازے کھولتی اور اس کے دل کی گندگیون کو دور کرتی ہے، اس لئے مذہب کا اصول اساسی اصل میں معرفت یزدانی ہے، جو صحتِ اخلاق کی ذمہ دار بھی ہے تاکہ نفس کی پاکیزگی غالب ہو، اور اوس میں لطافت کا عنصر قوی ہو، اور روح میں بلندی کا احساس اور وہ پرواز پیدا ہو، جو اس آب و گل کی دنیا کو معرفتِ ربانی کی تجلی گاہ سے قریب تر کر دے،

خدا کی رحمت ہو ان پر جنھون نے ابن آدم کو جہل و باطل کی تاریکیوں سے نکالا جنھون نے گم کردہ راہ دنیا کو حقیقت و صداقت کا راستہ دکھایا، مذہب اگر نہ ہوتا، تو نیکی و نیکو کاری، اور راستی و راستبازی کی تعلیم کون دیتا، یہ مذہب ہی کا احساس ہے، جس نے انسان کی روح میں بے چینی پیدا کر دی جس نے انسان کے دل میں تحقیق و جستجو کی آگ بھڑکا دی، یہ حقیقت ہے، کہ مذہب ہی نے سب سے پہلے اُس خدا کو پہچنوایا، جو مادی آنکھوں سے نظر تو نہیں آتا، لیکن روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا جاتا ہے، جو رسالت کے پنہاں خد و خال سے نقاب اٹھاتا، اور جو صداقت کے راستہ میں بڑی سے بڑی قربانی کو بازیچۂ اطفال سمجھتا ہے،

خلیل اللہ کا آتشِ نمرود سے کھیلنا، ذبیح اللہ کا قربانی کے لئے سر جھکا دینا، روح اللہ کا صلیب کی سختیان[1] اٹھانا، رسول اللہ کا توحید کے لئے دنیا بھر کا غم سہنا، خلیفۃ الرسول کا ابن ملجم کی پیاس بجھانا، اور سید الشہداء کا حق کے لئے جان دیدینا، دنیا کے حافظہ میں اب بھی باقی ہے، اور کیون نہ

[1] معارف :- بقول نصاریٰ



باتی ہو جب کہ یہ سب کچھ مذہب ہی کے احساسِ حقانیت کے مظاہر ہیں،

جان اس کائنات میں جیسی کچھ قیمتی شے ہے، اسکو جینے والوں سے پوچھئے، اس کی قربانی ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اسکو وہی دے سکتا ہے، جس کے قلبی تاثرات کسی ایسی حقیقتِ پنہان سے آشنا ہون جو جان سے زیادہ عزیز و برتر ہو، اسی کو جانتے ہوئے انھون نے دنیا کی فانی عشرتوں کو ٹھکرا دیا، وہ اگر چاہتے، تو بحکم خدا آسمانوں کی بلندیاں ان کے قدموں پر جھک جاتیں، شجر و حجر ان کے اشارون پر چلتے، دشت و جبل ان کی عظمت سے لرز جاتے، لیکن وہ تو زندگی کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے، ان کی دل کی آنکھین اس ہستی واجب الوجود کی تجلیات سے سرشار تھیں، جو ایسی بے شمار کائنات کا تنہا خالق و مختار ہے،

غرض جب مذہب کی بنیاد خدا کی معرفت اور خدا و بندہ کے رشتہ کے مضبوط کرنے پر ٹھہری، تو پھر تمام مذاہب کو ایک سطح پر رکھنا، اور اس طرح ان پر غور کرنا کہ گویا وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں شانِ اخلاقِ حق کے مشرب میں جائز نہ ہو، جب کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کائنات کا حکمران اور خالق ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہ بسیط اور لامحدود ہے، تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ الوہیت کے اظہار میں کس مذہب نے کن دلائل سے کام لیا ہے، اور خدا کی واحدانیت اور یکتائی کی توجیہ کس طرح کی ہے، اور خدا شناسی و خداداری کے لئے کون سے ایسے ذرائع متعین کئے ہین جنھیں عقلِ سلیم آسانی تسلیم اور کسی حجت کے بغیر اختیار کر سکے، مذاہب کی حقانیت کو سمجھنے کا یہی ایک ذریعہ ہے، اور اسی سے ہم مختلف مذاہب کے مابین حق و باطل کا امتیاز کر سکتے ہین،

ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ مذہب کا اولین عقیدہ ہے، اس میں دوسرے مذاہب نے کس قدر غلطیان کی ہیں، اور اہلِ مذہب کے قدموں کو کیسی کیسی لغزشیں ہوئی ہیں، وہ اس سے ظاہر ہے، کہ کسی نے اینٹ و پتھر کو خدا سمجھا، کسی نے بارش، ہوا، آگ اور سورج کو اپنا معبود بنایا، کسی نے ذات ربانی سے جسمانی اور انسانی خواص منسوب کر دیئے، کسی نے باپ اور بیٹے کے رشتوں کا جوڑ لگا دیا، غرض یہ کہ

معرفت ناقص اور ایمان فاسد رہا،

یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی ہے، کہ دنیا کا آخری مذہب اگر کوئی ہو سکتا ہے، تو وہ اسلام ہے، جو اپنی حقانیت اور خدا شناسی کے لحاظ سے خدا کا بالکل آخری پیغام ہے، اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا سب سے آسان اور قابل عمل طریقہ ہے، اسلئے اسلام کے ان خدائی خصوصیات کی موجودگی میں دوسرے مذاہب کے اصول سے اس کا مقابلہ کچھ دل لگتی بات نہیں معلوم ہوتی، ان میں اور اس میں جو بنیادی فرق ہے، اسکو صرف حقائق آگاہ نظریں ہی دیکھ سکتی ہیں،

مذاہب کے درمیان اختلافات کی صحت و عدم صحت کو جانچنے کا اگر کوئی معیار ہے، تو وہ صرف مسئلہ توحید ہے، وحدانیت ہی پر ہم اس مسئلہ کا فیصلہ کر سکتے ہیں، کہ کس مذہب کا درجہ کتنا بلند ہے، میری نظر میں فطری لگاؤ اگر کسی مذہب سے کسی مذہب کو ہو سکتا ہے، تو اس کی پہلی شرط وحدانیت ہے، اور وحدانیت ہی فطرتِ الٰہی ہے، آئیے، ہم ذرا دنیا کے ان مذاہب کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں،

مجھے کسی خاص مذہب سے نہ کوئی پرخاش ہے، اور نہ میرے یہ خیالات تعصب و تنگ نظری پر مبنی ہیں، کیونکہ میری فطرت کی تشنگی تو ایک ایسے عالمگیر اخوت کے سرچشمہ کی متلاشی ہے، جو ساری کائنات کو ایک نقطہ پر جمع کرے، جہاں انسانیت کا احترام ساری بندشوں سے بلند اور برتر تسلیم کیا جائے اور میرے نزدیک یہ صلاحیت صرف اسلام میں ہے، جہاں نہ رنگ و نسل کا اختلاف ہے، اور نہ حالت و حیثیت کا امتیاز، اسکی یہ صلائے عام ساڑھے تیرہ سو سال سے بلا کسی وقفہ کے کائنات میں گونج رہی ہے،

ویدمت نے اپنی مذہبی تعلیمات کا خاکہ اس وقت کھینچا ہے، جب انسان نے تمدن کے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کئے تھے، ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان رموز و اسرار الٰہی کو سمجھنے کی کیونکر اہلیت رکھ سکتا تھا، اور نہ اس کے دماغ میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی تھی، کہ وہ عیب و صواب کو پہچان سکتا برے بھلے



میں امتیاز کر سکتا، اس کی معصومانہ عقل نے فطرت کے مظاہر کو خدا سمجھ لیا، اور بجائے اس کے کہ رب الارباب کی عبادت کرتا، خاکی اور فانی موجودات کو معبود جاننے لگا، وہ تو مقلدانہ دماغ لیکر پیدا ہوا تھا، جس نے جو راستہ بتایا، اس پر بلا سوچے سمجھے چل کھڑا ہوا، اس کی عقل و فہم کے نزدیک کسی اور رب الارباب کا وجود اسوقت تھا ہی نہیں اس کو یقین تھا کہ اسکی زندگی کا عروج و زوال اور فتح و شکست سب کچھ انہی مظاہر کے رحم و کرم اور قہر و غضب پر ہے،

اس کے بعد جب دنیا نے ایک اور کروٹ لی، اور تمدن کی ترقی کیساتھ ساتھ مذہبی رسوم کی ادائی میں طوالت اور پیچیدگی ہونے لگی، تو ان کو ور کرنے کی ذمہ داری ایک خاص گروہ کے سپرد کی گئی جو برہمن کہلائے، نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی تقدس اس گروہ کی ذات میں ہمیشہ کے لئے منتقل ہو گیا، اور یہیں سے برہمنزم کی ابتداء ہوئی، غرض برہمن مت پر مختلف دور آتے رہے ہیں، ایسے دور جو ایک دوسرے سے کوئی بنیادی تعلق نہ رکھتے تھے، میں اگر غلطی نہیں کرتا، تو عہدِ حاضر میں مورتی پوجا کی رسم اب سوائے ہندوستان کے اور کسی ملک میں نہیں پائی جاتی، اور یہ بھی اسی مت کی باقیات سے ہے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے فلسفۂ ویدانت میں وحدانیت بہ حیثیت ایک مرکزی عقیدہ کے شروع ہی سے موجود نہیں ہے، قدیم ہندو فلسفہ کا ایک شعبہ "سانکھیہ" تھا، جس میں تکوینِ عالم کے نظام سے بحث کی گئی ہے، جس میں یہ موجود ہے کہ مادہ ہی دنیا کی علت ہے، اور پرماتما یا ایشور کا کوئی وجود نہیں، اس فرقہ کے لوگ ۲۵ عناصر کے قائل ہیں، نویں صدی عیسوی میں شنکراچاریہ کے مت نے قدیم مت کی اصلاح میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے، انھوں نے برہم کی ہستی واحد کو لائق پرستش قرار دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا کو بھی جائز رکھا، ہندو مذہب کا اساس اب ان تین کتابوں پر قائم کر لیا گیا ہے

(۱) چاروں وید، (۲) گیتا، (۳) منوسمرتی یہ تینوں کتابیں تاریخی حیثیت سے تین مختلف دوروں سے تعلق رکھتی ہیں، اور یہ ہر سہ کتب قصے کہانیوں، فلسفۂ زندگی، اور قانونِ حیات کو اپنے اوراق میں

سمیٹے ہوئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ ویدوں نے انسانوں کو کوئی ایسا تخیل بھی دیا ہے جو ان ظاہری دیوتاؤں سے بلند کسی واحد خالق کائنات کی ہستی سے متعلق ہے، ممکن ہے کہ یہ قول صداقت پر مبنی ہو لیکن یہ ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر عملی دنیا میں نہیں ملتی، رہ گیا بدھ مت سو وہ ایک "اہنسائی" مذہب ہے جس کے احکام عشرہ میں سے سب سے پہلا یہ تاکیدی حکم ملتا ہے کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کرو، بودھ نے انسان کی زندگی کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا ہے، وہ دنیا کے دوسرے حکما اور بانیان مذاہب کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے یہ سمجھنے کی سرے سے کوئی کوشش ہی نہیں کی کہ انسان دنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے، اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے، ان کے تمام گیان اور دھیان کا یہ نتیجہ نکلا کہ زندگی فی نفسہ ایک مصیبت ہے، اس چکر سے نجات پانے کی کیا شکل ہے، اس کو بودھ نے صرف ایک لفظ "نروان" سے حل کیا ہے، اس عقیدہ میں کسی خالق اور مالک کائنات کا وجود شامل نہیں ہے، صرف اس تخیل میں تناسخ کا چکر ضرور ہے، گوتم بدھ کی مت کوئی مذہب نہ تھا، بلکہ ایک اخلاقی فلسفہ تھا اس کے معتقدات کا سلسلہ کسی خالق کائنات سے نہ ملتا تھا، درحقیقت بودھ کے سلسلہ میں خدا کوئی چیز ہی نہ تھا، ان کے بعد بودھ کے پیروؤں نے خود بودھ کے وجود کو خدا مان لیا، اور عقیدہ یہ قرار پایا کہ بودھ ایک اوتار کی شکل میں بار بار پیدا ہوتا ہے، اور اہل دنیا کے لئے نروان کا راستہ کھولتا ہے،

انجیل کے متعلق مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ نزول کے وقت خدائی کتاب تھی، حضرت عیسیٰؑ کی پیغمبرانہ شخصیت بھی اُن کو تسلیم ہے، لیکن یہ کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا، کہ توحید کے صحیح اصول کا فقدان یہاں بھی ہے، توحید کسی نجات دہندہ بیٹے کے وجود اور کسی روح القدس کی شرکت عمل سے بے نیاز ہے، توحید تو وہ رازِ عرفان ہے، جو بجائے خود نجات دہندہ بھی ہے، تجلّی ربانی بھی ہے، اور معرفت الٰہی کا سیدھا راستہ بھی،

اسی لئے اسلام نام ہے صرف توحید کا، دعوت توحید کا اور دنیا کو معبودان باطل کی پرستش



سے چھڑانے اور ایک نقطۂ نظر پر جمع کر دینے کا جبھی تو اس کو تمام ادیان سابقہ کا نچوڑ کہا جاتا ہے، اور دنیا میں صرف یہی مذہب ہے جس میں حشو و زوائد کا نام نہیں ہے، اور اوہام و قیاسات سے اسے کوئی کام نہیں ہے، اور جو یہ دعوی کرنے میں اپنے حقائق کے اعتبار سے بالکل حق بجانب ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر تہذیب کی رہنمائی کے لئے خلق ہوا ہے، یہی سبب ہے کہ ہر شخص اس پر آسانی سے عمل کر سکتا ہے اور اس کی تعلیمات کو اختیار کر کے دنیا کے کاروباری ہجوم میں معرفت الٰہی حاصل کر سکتا ہے،

اسلام کی تعلیم ترک دنیا کو برا سمجھتی، اور ایسی ریاضتوں کو غیر ضروری ٹھہراتی ہے، جس کو کمزور انسان برداشت نہ کر سکے، نہ وہ کسی کی قربانی کو ذریعۂ نجات تسلیم کرتی ہے، نہ وہ بنی نوع انسان میں کسی اختلاف کو جائز سمجھتی ہے، وہ تو تمام انسانوں کو خدا کا بندہ سمجھنے کی توفیق دیتی ہے، اور تعصب و تنگ نظری کے تمام نظریوں کو انسانیت کی انتہائی توہین جانتی ہے، اور یہی اُس کے اصلی جوہر ہیں،

اسلام نے کہیں بھی تجلیات الٰہی کو خدا کا اوتار یا نجات دہندہ ظاہر نہیں کیا، وہ تو پیغمبر ہوں یا امام، اصفیا ہوں یا اولیا سب کو خدا کا بندہ قرار دیتا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ خدا کے بعد اگر کسی کا مرتبہ ہو سکتا ہے تو وہ خدا کے بندہ ہی کا ہو سکتا ہے،

"کاش انسان کو بندہ ہونا نصیب ہو جائے!!!"

غرض اسلام میں نہ کوئی خدا کا بیٹا (نجات دہندہ) ہے، نہ کوئی اوتار برگزیدہ کائنات ہے نہ کوئی ایسا خدا ہے، جو دنیا کی اصلاح کے لئے مختلف زمانوں میں مختلف چولے بدلتا رہتا ہے، نہ اسلام کا خدا کسی کا سہارا چاہتا ہے،

وہ خالق ہے اور مخلوق کی تمام صفات سے بلند اور منزہ، وہ واحد ہے، اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے افعال اور اعمال کے لحاظ سے، وہ واحد ہے اپنے وجود اور مقصود کے لحاظ سے،!

یہ ہے اسلام اور اس کی خصوصی تعلیم جس کا نہ دوسرے مذہب کے کوئی فطری لگاؤ ہو سکتا ہو اور نہ وہ اپنی تعلیمات کی ان بدیہیات کے لحاظ سے فطری کہلانے کے مستحق ہیں، اسی پر انسانیت کو صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہئے، یہی عقل کا بھی اقتضا ہے، اور یہی فہم کا بھی ارشاد،

میں نے مختصراً ان مذاہب اربعہ کا دھندلا سا خاکہ اسلئے پیش کیا ہے، تا کہ معلوم ہو جائے کہ کیا دنیا بغیر فطری مذہب کے صحیح معنوں میں زندہ رہ سکتی ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا، کہ مذہب کو کن حقائق و معارف کا سرچشمہ ہونا چاہئے، اور عہد جدید میں جس مذہب کی پیروی انسان کے بڑھتے ہوئے ولولوں کا ساتھ دے سکتی ہے، وہ صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے، اب اگر صرف وحدانیت کے معیار پر ان متذکرہ مذاہب کو جانچا جائے، جس کی نسبت بعض یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کیساتھ فطری لگاؤ رکھتے ہیں، تو ان مذاہب کے مجولہ تاریخی واقعات لگاؤ پیدا کرنے سے ساکت پائے جاتے ہیں،

اصلی بحث تو یہاں ختم ہو جاتی ہے، مگر چونکہ عبادت مذہب کا رکن رکین ہے، اور نواب مرزا یار جنگ بہادر نے اس پر کیا ایسے انداز میں اظہار خیال فرمایا ہے جسے سمجھنا ضروری ہے، اسلئے چلتے چلتے چند سطریں اس پر بھی ملاحظہ فرما لیجئے، نواب صاحب کا خیال ہے کہ عبادت کے لئے کسی خاص طریقہ عبادت کی ضرورت نہیں ہے، مجھے نواب صاحب کی بلند نگاہی میں شک نہیں ہے، لیکن اس انکشاف جدید کو سمجھنا میری محدود عقل سے باہر ہے، کیونکہ میں تو آجتک یہی سنتا آیا ہوں کہ جس مذہب نے آنکھ کھولی خواہ وہ باطل ہو یا کامل، خدا کی عبادت کا ایک مخصوص طریقہ اپنے ساتھ لایا جسے بانیان مذاہب نے اپنے عمل سے سمجھایا اور بتایا، اسلئے ارکان عبادت سے انکار میرے لئے تو یقیناً ایک انکشاف جدید کی حیثیت رکھتا ہے

بہر نوع اسقدر معلوم ہے کہ اس مادی دنیا میں بھی مختلف قوانین کی پابندی کئے بغیر زندگی کے دشوار گذار منازل کا طے کرنا دشوار ہے، اسی طرح روحانی عالم کے لئے بھی چند پابندیاں ضروری ہیں، جن کے بغیر قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ افعال صادر نہیں ہو سکتے، یہ تو علم النفس کا معمولی



مسئلہ ہے، کہ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک خاص ماحول کی ضرورت ہے جبتک وہ ماحول پیدا نہ کیا جائے، کامیابی نہیں ہو سکتی، اسلام نے بھی ارکان عبادت متعین کئے ہیں، اور جہاں تک میری نظر پہنچ سکی ہے یہ کوئی فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری نہیں ہے، عبادت میں قیام و قعود اور رکوع و سجود کی جو قید عائد کی گئی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جب معبود حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو تو عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائے، یہ جذبۂ عبودیت کے فطری طریقے ہیں جنھیں مرتب کرنے کی مصلحت یہ بھی ہے، کہ عبادت کے موقع پر یکسانیت کیساتھ خدا کی تحمید و تسبیح کیجا سکے، پھر یہ اعمال صرف انسانی دماغ کی اختراع نہیں ہیں، بلکہ قرآن پاک میں بھی جابجا رکوع اور سجود کی ہدایت پائی جاتی ہے:-

یا ایھا الذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا، جس شخص کا ایمان و ایقان یہ ہو کہ قرآن مجید کلام ربانی ہے، وہ کسی طرح عبادت کے ان مقررہ طریقوں سے قطع نظر نہیں کر سکتا، فطرت الٰہی کے جو رموز عبادت کے ان قواعد و ضوابط میں مرکوز ہیں، وہ ہم ایسے انسانوں کے فلسفہ کے دسترس سے بالاتر ہیں، اگر پوری تقریر ہمارے سامنے ہوتی، تو ہم اس سے زیادہ فاضل مقرر کا منشا اور مفہوم سمجھ سکتے تھے، بہر نوع خدا کی موجودگی شرح سے بے نیاز اور مذہب کی حقانیت ثبوت سے مبرا ہے لیکن وہ مذہب جو تاریکیوں کو دور کردے جو اوہام کو مٹا دے اور جو حقیقت و صداقت کو ضمیر انسانی پر آشکار کردے، ایسا مذہب قدیم روایات کے سایہ میں نہیں ملتا، بلکہ آزادانہ غور و فکر سے حاصل ہو سکتا ہے اس لحاظ سے حضرت بندگان عالی کا یہ ارشاد حرز جان بنانے کے قابل ہے کہ

"ایک طرف مسئلہ مذہب کو کماحقہ سمجھنا جیسا کچھ دشوار نظر آتا ہے، تو دوسری طرف یقیناً وہ بہت آسان ہو جاتا ہے، جبکہ تعصب کی عینک سے اس کے خط و خال نہ دیکھے جائیں، بلکہ عقل کی صحیح رہبری کی روشنی میں اس کی تہ کو معلوم کر لیا جائے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں ہے، الا ماشاء اللہ،

(صبح دکن مورخہ ۱۵ر جمادی اول ۱۳۵۵ھ)

یہ مذاہب اربعہ کے متعلق وہ سطور اربعہ ہیں، جنکو وہی سمجھ سکتے ہیں، جن کی نظر میں اتنی بلندی ہو اور جن کی فطرت ایسی عالی ہو، ایک طرف یہ سطرین پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم اس مجتہدانہ دماغ کی پیداوار ہیں، جس نے صحیح عقل کی رہبری میں مذاہب عالم کو جانچا، اور سمجھا ہے اور اس پختہ کارانہ انداز میں سمجھا ہے کہ دنیا کی کم سواد عقلیں اس گہرے نقش کو دھندلا بھی نہیں کر سکتیں، اور دوسری طرف یہ اذن ہے کہ اس بصیرت کا جسے دنیا مدت ہوئی حافظون سے محو کر چکی ہے، اس میں تعصب سے بچنے، اور حقیقت کو مبصرانہ نظر سے دیکھنے کی ایک حکیمانہ ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ نباض فطرت دماغ سلطانی اس سے واقف ہے، کہ زمانہ مذہب سے ناآشنا ہو چکا ہے، اس پر سلامت ذوق اور فطری استعداد کا بھی فقدان ہو چکا ہے، اسلئے "اس مشکل" کا بھی اظہار فرما دیا گیا ہے، کہ

"یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں ہے"

**معارف**:- حیدرآباد دکن کے نیگ مین کریچین ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ میں ہمارے محترم فاضل فلسفی بزرگ نواب سر امین جنگ بہادر نے "مذاہب اربعہ (یعنی برہمنیت، بودھ مت، علیسائیت اور اسلام) میں فطرت کا لگاؤ" کے عنوان پر تقریر فرمائی تھی، جس سے غالباً مقصود یہ ہوگا، کہ ان چارون مذہبون کے متفقہ نظریوں کو بیان کیا جائے، ہمارے ادیب دوست جناب ہوش صاحب بلگرامی (نائب معتمد افواج سرکار عالی) نے اس پر اس حیثیت سے تبصرہ کیا ہے، کہ اسلام کا نقطۂ نظر باقی ہر سہ مذاہب سے بدرجہا بلند، بہتر اور کامل تر ہے، ہمارے خیال میں ان دونوں میں صداقت ہے، یعنی ان چاروں مذاہب بلکہ دنیا کے سارے متمدن مذاہب میں کچھ اتحاد کے عناصر بھی ہیں، اور کچھ امتیاز کے بھی چونکہ نواب صاحب ممدوح کی ساری تقریر ہمارے سامنے نہیں اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا مقصد کیا تھا، مگر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ انھوں نے مذاہب اربعہ کے کسی متحدہ خیال پر گفتگو کی ہوگی، اور وہ صحیح ہوگی، مگر ایسے موقعوں پر صلح پسند اشخاص سے ہمیشہ یہ غلطی ہو جاتی ہے، کہ وہ اتحادی نظریوں کے ساتھ



ساتھ اپنے امتیازی نظریون کو نظرانداز کر جاتے ہیں، جس سے اکثروں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے،

نواب مرزا یار جنگ بہادر جن کی قانونی قابلیت کا اعتراف ہر شخص کو ہے، انکی نسبت جو خیال منسوب کیا گیا ہے، اگر وہ سچ ہے تو ان کا مقصد یہ ہوگا، کہ ایک مذہب کے طریقۂ عبادت کو دوسرے مذہب کے طریقۂ عبادت پر عقلاً کوئی ترجیح نہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ آریائی مذاہب کو چھوڑ کر جس میں خدائے واحد کی پرستش کا کوئی تخیل نہیں، یہودیت، علیسائیت اور اسلام کا طریقۂ عبادت بالکل یکسان ہے، اس وقت ان میں جو فرق ہے بھی وہ اسلئے ہے، کہ یہودیت اور عیسائیت نے اپنے انبیاء کے عملی طریقوں کو بھلا دیا ہے، یا بتدریج بمرورِ زمانہ اس میں ترمیم کر دی ہے،

اسلام میں دونوں قسموں کی عبادتیں مشروع ہیں، اس عبادت کی تعلیم بھی ہے جسمیں کسی طریقہ کی پابندی کی ضرورت نہیں، فرمایا:-

| | |
|---|---|
| یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا | وہ خدا کو کھڑے، بیٹھے، اور پہلو پر |
| وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ، (آل عمران - ۲۰) | لیٹے یاد کرتے ہیں، |

اور وہ عبادت بھی ہے جسکا ایک خاص طریقہ بھی مقرر کر دیا گیا ہے، جو ہمارے ہر سوچے ہوئے طریق عبادت سے زیادہ بہتر اور زیادہ مفید ہے، فرمایا:-

| | |
|---|---|
| وَقُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ (بقرہ - ۲۴) | اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو، |
| اِرْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا (حج) | رکوع کرو، اور سجدہ کرو، اور عبادت کرو، |

اسی لئے اسلام کا طریقِ عبادت دونوں قسموں کو محیط ہے، اور اسلئے سب سے زیادہ کامل ہے، غیر مخصوص طریقۂ عبادت، ہر وقت، ہر موقع پر کسی پابندی کے بغیر انجام پاتا ہے، اور مخصوص طریقۂ عبادت خاص شرائط کیساتھ خاص اوقات میں فرض ہے،

"س"

# ڈچ جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی حالت

"ایک پرجوش مسلمان عالم و تاجر محمد اسمٰعیل گاجھیلہ صاحب جنھوں نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی ہے، جانبرگ سے ایک مفصل خط ہم کو بھیجا ہے، جس کا حب ذیل اقتباس ہندوستان کے مسلمانوں کی عبرت کے لئے مفید ہوگا؛ "س"

یہاں جنوبی افریقہ میں جو ڈچ لوگوں کی عملداری میں ہے، ہندی قوم بھی آباد ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں قومیں ہیں، اب نئے ہندی کو یہاں داخلے کی اجازت نہیں، نیز قانونِ سکونت پذیری کی وجہ سے تقریبًا تمام ہندی اپنی عورتیں اور بچے یہاں بلوا لینے پر مجبور ہوئے، اسوقت ۸۰ فی صدی ہندی نژاد ہیں، اس دیس میں پیدا شدہ جوانوں کو ہندوستان سے کوئی نسبت نہیں ہے، اگر یوں کہا جائے کہ یہ اپنی اصل چھوڑ رہے ہیں، تو بالکل بجا ہے، اور مستقبلِ قریب میں یہیں کے ہو کر رہیں گے،

سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں کی گورنمنٹ نے ہمارے حقوق اور آزادی کو بالکل محدود کر دیا ہے، دوسرے الفاظ میں اگر یوں کہا جائے کہ ہماری آزادی سلب کر لی ہے تو زیادہ مناسب ہوگا،

یوروپین اور یہاں کے اصلی باشندے حبشی سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے، جسے کلرڈ (Coloured) سے موسوم کیا جاتا ہے، جو درجہ اس کلرڈ قوم کو دیا گیا ہے، وہی درجہ ہمارا شمار کیا جاتا ہے، پارلامنٹری قوانین میں ہمیں بھی لفظ کلرڈ ہی سے یاد کیا جاتا ہے، اگر ریل گاڑی میں سفر کیا جائے، تو ہمارے سیٹے یعنی کالی قوم کے لئے ایک کوچ مخصوص ہوگا، پوسٹ آفس (Post office) میں جہاں سے یورپین کو Serve ہوتا ہے، وہاں ہمیں اجازت نہ ہوگی، بلکہ ہم نان یورپین (Non European) کے لئے ایک کونہ میں کوئی جگہ مخصوص کر دی جاتی ہے، اسی طرح رہنے کے لئے ہمارے لئے محلے الگ ہوں گے، پبلک لائبریری میں جانے کا اور کتب بینی کا حق نہ ہوگا، ہوٹلوں اور سنیما میں ہم لوگوں کو جانے کی اجازت نہ ہوگی، مختصر یہ کہ ہمارا یہاں وہی درجہ ہے، جو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاں اچھوت قوم کا درجہ ہے،

مگر اس بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں اگر کوئی فرقہ ہمارا ہمدرد نظر آتا ہے، تو وہ پادریوں کا فرقہ ہے،

یہاں کی تہذیب و تمدن مغربی تہذیب و تمدن ہے، ہمارے نوجوان اس سے بہت جلد مرعوب ہو جاتے ہیں، اس کی کورانہ تقلید اور نقالی کرتے رہتے ہیں، ان جوانوں کے دلوں سے حرارتِ اسلامی زائل ہوتی جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو پورا مغربی دیکھنا چاہتے ہیں،

ہماری کچھ مسجدیں بھی ہیں، چھوٹے چھوٹے مدرسے بھی ہیں، ان مدرسوں میں قرآن شریف پڑھایا جاتا ہے، اس کے بعد اردو کی کچھ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جس میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے مسائل ہوتے ہیں، خصوصًا حضرت مفتی ہند کی تالیف کردہ تعلیم الاسلام، بہشتی زیور، انجمن حمایت اسلام لاہور کی اردو کی پہلی دوسری کتابیں وغیرہ پڑھائی جاتی ہیں، اور کبھی موقع مل گیا تو کوئی لڑکا فارسی کی بھی دو تین کتابیں دیکھ لیتا ہے، اب اس زمانہ میں جب یہ بچے مدرسے جاتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ان اسکولوں میں داخل کئے جاتے ہیں، جہاں انگریزی اور ڈچ پڑھائی جاتی ہے، چونکہ یہاں کا تمدن مغربی تمدن ہے، اسلئے انگریزی اسکولوں سے یہ بچے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن مدرسہ کی تعلیم رائگان جاتی ہے، یہاں تک کہ سارے مسائل پڑھ لینے کے بعد بھی وہ ٹھیک نماز کے ارکان سے واقف نہیں رہتے،

اس وقت عمومًا بچے چھٹے کلاس (Standard VI) تک اسکولوں میں انگریزی

تعلیم حاصل کرتے ہیں جس سے ان بچوں کی استعداد اتنی ضرور ہو جاتی ہے، کہ انگریزی کتابوں کا مطالعہ کرسکیں، اب ایسی حالت میں جب ان مسلم نوجوانوں کو اسلامی لٹریچر کا شوق ہوتا ہے، تو انھیں لامحالہ قادیانیوں جیسے فرقۂ باطلہ کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے،

ہمارے ہندوستان سے جو لوگ یہاں آئے تھے، وہ کمانے کی غرض سے آئے تھے، اور ان میں سے اچھے خاصے تجارت و بیوپار کرتے ہیں، باقی ان تاجروں کے یہاں نوکری کرتے ہیں، ہندی تجار میں اور قوموں سے سب سے زیادہ مسلمان بڑھے ہوئے ہیں، اور ان مسلمان تاجروں کی مالی حالت بفضلہ بہت اچھی ہے، مگر یہاں بھی ہمیں اپنی بدقسمتی پر رونا پڑتا ہے، زکوٰۃ ادا کرنے میں بڑے سست اور بڑی بخل سے کام لیتے ہیں، اس بخل اور حرص کی وجہ سے آپس میں محبت کم ہے، اور مسلمانوں کی اس وقت کوئی خاص متفقہ جماعت بھی نہیں ہے، اس کا جو برا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے، اس کا اندازہ ذیل کی سطروں سے ہو سکے گا،

صوبہ ٹرانسوال میں جانبرگ (johannesburg) اور پری ٹوریہ (Pretoria) جیسے عظیم الشان شہروں میں ہماری نہ کوئی علمی مجلس ہے، نہ کلب اور نہ لائبریری ہیں، شام کو نوجوان لڑکے کاروبار سے فارغ ہونے کے بعد سڑکوں پر نکل پڑتے ہیں، اور یا تو مذکورہ کلرڈ قوم کی لڑکیوں کے ساتھ ادھر اُدھر آوارہ گردی کرتے نظر آتے ہوں، یا مخصوص کلرڈ سینما میں جاتے ہیں، یا انہی کلرڈ لڑکیوں کے ساتھ ناچ ہال (Dance hall) میں جا کر ناچتے ہیں، اور سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو یہاں کے لوگوں کے خیالات دو قسم پر منقسم ہو گئے ہیں، ایک گروہ اس بات کا انتظار کر رہا ہے کہ ہندوستان کو جلد آزادی حاصل ہو جائے، تاکہ امن و سلامتی کی زندگی نصیب ہو، اور ہمارے تمام حقوق کی نگہبانی "آزاد ہند" کی حفاظت میں دی جائے، دوسرے گروہ کا خیال ہے، کہ اسی قوم (نن یوروپین) میں مدغم ہو کر افریقی بنجانا چاہیے،



جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں کہ اگر ہندی قوم کا کوئی ہمدرد نظر آتا ہے تو پادریوں کا فرقہ ہے، ان پادریوں کی حمایت کا اثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ صوبہ مدراس کی جو مزدور قوم یہاں آکر آباد ہوئی تھی، ان میں سے اچھے خاصے عیسائی نظر آتے ہیں، اگرچہ مسلمانوں پر ان لوگوں کا ابتک کوئی اثر مذہباً نہیں پڑا ہے، مگر تاہم،

ہمارے ہندی مسلمانوں کے علاوہ یہاں ملایا کے مسلمان بھی ہیں، جو ہالینڈ کے لوگوں کے ساتھ جو ملایا میں تجارت کرتے تھے، کیپ پراونس میں آبسے تھے یہ عموماً غریب اور مزدور پیشہ ہیں، اسوقت انھیں ملایا سے کوئی واسطہ نہیں رہا، وہ صرف اتنا جانتے ہیں، کہ ہمارے باپ دادا ملایا سے یہاں آئے تھے، اور اب ان کی اولاد در اولاد یہاں آباد ہے، کچھ ٹرانسوال اور نٹال میں بھی ہیں، چونکہ میں خود کیپ پراونس نہیں گیا ہوں، اسلئے ان کے متعلق زیادہ معلومات نہیں لکھ سکتا، مگر یہاں بھی کچھ ملائی ہیں، اسلئے اتنا ضرور عرض کرسکتا ہوں کہ وہ اپنے بزرگوں، اور باپ دادا کے سکھائے ہوئے مذہب کے اب تک پابند ہیں،

اب مسلمانوں کا فرض یہ ہے، کہ اپنی غفلت چھوڑ کر ان نوجوان مسلمانان جنوبی افریقہ کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیم پیش کریں، تاکہ وہ آئندہ خطرات سے محفوظ رہیں، لیکن اگر یہاں کے مسلمانوں کی حفاظت اور تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ سامان نہ ہوا، اور مسلمانوں کی غفلت بدستور باقی رہی، تو یہ (۱) نوجوان یا عیسائی تمدن میں گرفتار ہو جائیں گے (۲) یا قادیانیت ان پر غالب آجائے گی، (۳) اور بہت ممکن ہے، کہ یہاں کی کلرڈ قوم میں مل کر اپنی اصلیت کھو بیٹھیں، اور پھر شاید ایک زمانہ کے بعد یہ مسلمان برباد بھی ہو جائیں،

# تلخیص و تبصرہ

## رومن کیتھولک چرچ اور اسلام

اس عنوان سے لیوکولم (Leo Cullum) کا ایک مضمون مسیحی رسالہ مسلم ورلڈ (جولائی ۱۹۳۶ء) میں شائع ہوا ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ رومن کیتھولک کلیسا کی تبلیغی سرگرمیاں مسلمانوں میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئیں، اور کن وجوہ سے ابتک خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی، اس کے بعد وہ تجویزیں بیان کی گئی ہیں، جن سے آیندہ بہت کچھ توقعات ہیں، عیسائی مبلغین کے زیر اثر مسلمانوں میں جو اصلاحات دکھائی گئی ہیں، ان میں طاقتوں کی تخفیف کا ذکر مسلم ورلڈ ہی کے جرمی مقالہ نگار سے ممکن تھا، مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

جنگ عظیم کے وقت سے رومن کیتھولک کلیسا کی تبلیغی سرگرمیاں زیادہ ہو گئی ہیں، یہ جوش پوپ بنیڈکٹ پانزدہم (Benedict XV) کے دور (۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۲ء) میں بھی زیادہ تھا، اور پھر اس سے زیادہ موجودہ پوپ پئیس یازدہم (Pius XI) کے زمانہ میں دیکھا جا رہا ہے، ان تبلیغی سرگرمیوں میں یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اب مسلمانوں کی طرف بہ نسبت پہلے کے زیادہ توجہ کیجانے لگی ہے، موجودہ پوپ نے خصوصیت کیساتھ مسلمانوں کی طرف توجہ کی ہے اور اسی غرض سے رومہ کے اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں ایک شعبہ علوم اسلامیہ کا قائم کر دیا گیا ہے، اس توجہ کا باعث محض جوش تبلیغ ہی نہیں، بلکہ اس میں جدید دنیاے اسلام کے ذہنی انقلاب کو بھی بہت کچھ



دخل ہے، رومن کلیسا ان جدید خیالات سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے، جنھوں نے ملت اسلامیہ میں ایک حرکت پیدا کر دی ہے، اور ان بندوں کو توڑ دیا ہے، جو ابتک دنیاے اسلام کو مسیحیت کے تبلیغی حملوں سے روکے ہوئے تھے،

تبلیغ کے دو طریقے استعمال ہوتے آئے ہیں، بلاواسطہ اور بالواسطہ، بلاواسطہ تبلیغ کا طریقہ یہ ہے کہ وعظ اور تقریر کے ذریعہ عیسائیت کی اشاعت کی جائے، یا سوال وجواب کے ذریعہ اس کی تعلیم دیجائے، برخلاف اس کے بالواسطہ تبلیغ میں اشاعت مذہب کے تمام دوسرے ذرائع شامل ہیں، مثلاً صدقہ وخیرات، دعا، بیماروں اور غریبوں کی خبر گیری، تعلیم، نمونۂ عمل، اور قبول عیسائیت میں تعصب نے جو رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں، اُن کو دور کرنا، اس وسیع طریقۂ تبلیغ میں ہر وہ عیسائی حصہ لیتا ہے، جو دعا، نمونۂ عمل یا کسی دوسرے روحانی یا مادی ذریعہ سے لوگوں کو دائرۂ مسیحیت میں داخل کرنے کی کوشش کرتا ہے،

اسوقت مسلمانوں میں عیسائیت کی اشاعت کے لئے بلاواسطہ تبلیغ کا طریقہ شاید ہی کہیں موجود ہو، چند تجربہ کار پادریوں نے جو اس مسئلہ پر ماہرانہ رائے دے سکتے تھے، مسلمانوں میں بلاواسطہ تبلیغ کرنے کی مخالفت کی ہے، یہی وجہ ہے کہ مسیحی مبلغین نے ہر جگہ بالواسطہ طریقہ کو استعمال کیا ہے، اور بیماروں اور غریبوں کی خبر گیری کر کے نیز انھیں خود ان کے مذہب کے امور خیر کی تلقین کرتے ہوئے، ہمیشہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان تعصبات کی جو دیوار حائل ہے، وہ گرا دیجائے،

جن ملکوں میں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے غیر مسیحی فرقے آباد ہیں، وہاں عیسائی مبلغین نے براہ راست مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ اپنی توجہ غیر مسلموں پر مبذول رکھی ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ مبلغین کے رفاہ عام کے کاموں سے مسلمان بھی اکثر فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی لئے کسی نہ کسی حد تک ان کے زیر اثر رہتے ہیں،

تمام کیتھولک مشنوں کا مقصود کلیسا کا استحکام ہے، جس کا مدار قبول عیسائیت کی کثرت پر ہے،

لیکن اس نقطۂ نظر سے اُن مشنوں کے کارنامے شاندار نہیں جو مسلمانوں میں کام کرتے ہیں، فرائی ٹاگ (FREITAG) نے سچ کہا ہے کہ جن ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی بہت کثرت سے ہے وہاں خود مسلمانوں میں مبلغین کے کارنامے بمنزلۂ صفر کے ہیں، یا جیسا کہ چارلس (CHARLES) کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے قبولِ اسلام کے امکان پر جو اس قدر بحث و مباحثہ ہوتا آیا ہے، وہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اب تک عیسائی مشن کو اسلام کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے

یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ بالواسطہ تبلیغ کے دوسرے نتائج کیا ہیں، تاہم اس طریقِ کار سے اسلام پر جو اثر بتدریج پڑ رہا ہے، اس کا اندازہ ان اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے، جو اسلام کے تین بڑے مرکزوں شمالی اور شمالی مشرقی افریقہ، مغربی ایشیا اور ہندوستان سے متعلق ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

سنہ ۱۹۳۳ء میں شمالی اور شمالی مشرقی افریقہ میں (۲۸۵) ابتدائی مدارس تھے، جن میں طلبہ کی تعداد (۷۰۴۳۴) تھی، (۱۰۳) ثانوی مدارس تھے، جن میں (۸۶۵۳) طلبہ تعلیم پاتے تھے، (۲۱) طبی مشنری تھے، (۱۴) ہسپتال تھے، جنمیں (۱۴۰۰) مریضوں کے قیام کا انتظام تھا، (۱۲۹) دواخانے تھے، جہاں ایک سال میں (۲۹۴۲۰۷۷) آدمیوں کا علاج ہوتا تھا، (۷) برص وجذام کے شفاخانے تھے، جن میں مریضوں کی تعداد (۳۷۰) تھی، (۹۴) یتیم خانے تھے، جہاں (۴۴۳۶) بچے رہتے تھے، (۱۹) قیام گاہیں بوڑھوں کے لیے تھیں، جہاں (۲۴۷۱) آدمی اپنی زندگی کے آخری ایام گذار رہے تھے، (۷) چھاپے خانے تھے، جہاں سے (۱۴) رسالے نکلتے تھے، اور ان کی اشاعت (۱۳۰۶۰) تھی، یہ اعداد افریقہ کے اس خطہ سے متعلق ہیں، جس میں مسلمانوں کی آبادی (۶۰) فی صدی ہے، اس میں سے بعض حصوں میں تو مسلمان نہایت کثرت سے آباد ہیں، مثلاً مراقش میں (۹۷) فی صدی اور مصر میں (۹۱) فی صدی، اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جن کاموں کا ذکر اوپر ہوا، ان سے بہت زیادہ فائدہ



مسلمان ہی اٹھائیں گے،

مغربی ایشیا (ترکی، عراق، ایران، شام فلسطین اور عرب) میں بھی تبلیغی مشن کے رفاہی کارنامے کچھ کم شاندار نہیں، البتہ یہاں زور دواخانوں پر کم اور مدارس پر زیادہ ہے، اگرچہ یہاں کا کام زیادہ تر عیسائی فرقوں کی اصلاحِ حال پر مشتمل ہے تاہم اس کا اثر بعض مقامات پر مسلمانوں پر بھی بہت وسیع ہے، مثلاً شام میں ۱۹۲۵ء میں (۹۹۳) عیسائی مدارس تھے، جن میں (۵۰۰) کیتھولک تھے، تمام مدارس کے طلبہ کی مجموعی تعداد (۱۱۳۳۵۹) تھی، اور عیسائی مدارس کے طلبہ کی (۴۸۵۰۹)، پھر بھی شام میں مسلمانوں کی آبادی (۶۰) فی صدی تھی، اسی طرح بیروت کی سینٹ جوزف یونیورسٹی بھی، جس میں مسلمان طلبہ کی تعداد اگرچہ کم ہے، کچھ نہ کچھ اثر ڈالتی ہے، وہاں سے تین عربی رسالے بھی نکلتے ہیں

برما اور سیلون کو چھوڑ کر خاص ہندوستان میں آخری اعداد و شمار کے مطابق (۱۲۱۸) مبلغین کام کر رہے تھے، ان میں (۱۱۱۳) غیر ملکی اور (۹۱۹) ملکی پادری تھے، (۲۸۲) غیر ملکی، اور (۲۶۲) ملکی برادرس (BROTHERS) اور (۱۸۴۲) غیر ملکی اور (۲۵۰۰) ملکی سسٹرس (SISTRESS) تھیں، طبی مشنریوں کی تعداد (۱۹۵) تھی، (۳۸۹۱) ابتدائی مدارس تھے، جن میں (۲۰۷۴۵۴) بچے تعلیم پاتے تھے، (۵۶۲) ثانوی مدارس تھے، جن میں طلبہ کا شمار (۷۹۱۹۰) تھا، (۴۰) ہسپتال تھے، جن میں (۱۰۱۶) مریضوں کے قیام کا انتظام تھا، (۲۴۵) دواخانے تھے، جہاں (۱۷۱۱۲۴۵) آدمیوں کو دوائیں دی گئی تھیں، (۸) برص وجذام کے شفاخانے تھے، جہاں (۷۵۰) مریضوں کا علاج ہو رہا تھا، (۲۰۳) یتیم خانے تھے، جن میں (۱۷۶۹۰) بچوں کی پرورش ہوتی تھی، بوڑھوں کے لئے (۴۹) قیام گاہیں تھیں، جہاں (۱۴۱۳) آدمی رہتے تھے، (۲۵) چھاپہ خانے تھے، جہاں سے (۶۹) رسالے نکلتے تھے، اور ان کی تعداد اشاعت (۹۰۵۶۵) تھی،

یہ اعداد و شمار شاندار ضرور ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں میں تبلیغِ عیسائیت کا تعلق ہے، ان

اعداد سے صحیح نتیجہ نکالنے میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ ستر لاکھ ہے، اس کا پانچواں حصہ عیسائی مشن کے چار حلقوں یعنی ڈھاکہ، چٹاگانگ، کرشن نگر، اور لاہور میں آباد ہے، اوسطاً ایک لاکھ ستر ہزار کی آبادی پر ایک مشنری مقرر ہے، برخلاف اس کے ہندوستان کے جنوبی حصہ میں کیتھولک آبادی نسبتہً زیادہ ہے، یعنی کوٹار، ترچی کورن، منگلور اور ویراپولی کے تبلیغی حلقوں میں اوسطاً تین ہزار نوسو کی آبادی میں ایک مشنری کام کرتا ہے، لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم آبادی اور کیتھولک تبلیغ کے مرکز ایک دوسرے سے بہت دور دور واقع ہیں، یہی صورت ایشیاے کوچک اور عموماً ان دوسرے ممالک کی بھی ہے، جہاں مختلف فرقوں کی آبادیاں ملی جلی ہیں،

مسلمانوں کا ایک چوتھا بڑا مرکز جاوا ہے، اسکی حالت دوسرے اسلامی مرکزوں سے مختلف ہے، تمام اسلامی ممالک میں جاوا ہی وہ ملک ہے، جہاں مسلمان بکثرت عیسائی ہوئے ہیں، یہ کام تقریباً تمامتر اسکولوں کے ذریعہ ہوا ہے، اور اسّی فی صدی کیتھولک وہی لوگ ہیں، جو ابتداءً مسلمان اور مسیحی اسکولوں کے تعلیم یافتہ تھے، جاوا میں مشن کا کام ابھی نیا ہے، اور دراصل اسی صدی سے شروع کیا گیا ہے، تاہم ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۵ء تک دس ہزار مسلمان کیتھولک عیسائی بنائے جاچکے ہیں،

مندرجۂ بالا اعداد سے بالواسطہ تبلیغ کی سرگرمیاں کسی قدر معلوم ہوتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ حاصل کیا ہوا؟ اس باب میں اعداد و شمار کی جستجو کے معنی یہ ہیں، کہ تبلیغی کام کو مطلق سمجھا ہی نہیں گیا، اس تبلیغ کا مقصد صرف یہ رہا ہے، کہ زمین تیار کر دی جائے تاکہ تخم ریزی ہو سکے، اور تمام مبلغین متفق ہیں، کہ اس مقصد کے حاصل کرنے میں بالواسطہ طریقِ تبلیغ کامیاب ثابت ہوا ہے، خود مبلغین کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ زیادہ دوستی اور رواداری کا ہو گیا ہے، مسیحی اخلاق نے مسلمانوں کے اخلاق کو بلند کر دیا ہے، طلاقوں میں تخفیف کر دی ہے، اور زن و شو کے تعلقات کو بہتر بنا دیا ہے،



تاہم اب بھی بہت زیادہ کام باقی ہے،

لیکن عیسائیت کا روشن ترین کارنامہ وہ نہیں ہے، جو اب تک کیا جاچکا یا کیا جارہا ہے، بلکہ وہ ہے، جو آیندہ ہوگا، مسیحی دنیا کا متفقہ مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے خاص طور پر مبلغین تیار کئے جائیں، پوپ پیس یازدہم نے ۱۹۲۴ء میں یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ محض تبلیغی سرگرمی کافی نہیں، اور نہ کامیاب تبلیغ کے لئے صرف تجربہ کام دے سکتا ہے، قربانی اور محنت کا ثمرہ اگر حاصل کرنا ہے، تو اس کے لئے سائنس کی روشنی میں ایسے طریقوں کے دریافت کرنے کی ضرورت ہے، جو سب سے زیادہ موثر ثابت ہوں،

اس بنا پر آیندہ اسی شخص کو مبلغ مقرر کیا جائے گا، جو مسلمانوں سے پوری طرح واقف ہو، اور جس کا دماغ ان تمام غلط فہمیوں سے خالی ہو، جو عام طور پر اسلام کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں، اس مبلغ کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ مسلمانوں کے معائب اور جو چیز اس سے زیادہ مشکل ہے، یعنی ان کے محاسن سے بھی باخبر ہو، سائنٹفک طریقہ پر کام کرنے کی خواہش نے الفاظ سے گذر کر عملی شکل بھی اختیار کر لی ہے، چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر پیرس کے کیتھولک انسٹی ٹیوٹ نے ۲۷-۱۹۲۶ء میں اسلام پر مسلسل خطبات دلوائے تھے، اور ۱۹۲۳ء میں یوگوسلافیا کی ایک یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تبلیغی مشن کے لئے ایک شعبہ اپنے ہاں قائم کیا تھا، علاوہ بریں رومہ کی گرگیرین یونیورسٹی اور ببلیکل اور اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں تبلیغ کے سہ سالہ نصاب میں مندرجہ ذیل مضامین بھی شامل ہیں:-

اسلامی دینیات، متن قرآن مجید، اسلام افریقہ میں اور عربی، ترکی اور شامی زبانیں،

تبلیغی نظام کے دو جزو اور بھی ہیں، دعا اور درویشوں کے حلقے، دعا تبلیغ کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے، پادریوں کی مختلف جماعتوں نے یہ کام شروع کر دیا ہے، اور اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے، جو عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک متبرک ہے، درویشوں

کے حلقون کی تجویز موجودہ پوپ کی پیش کردہ ہے، ان حلقون سے قرونِ وسطیٰ میں تبلیغ کو بہت تقویت پہنچی تھی، اور یورپ کی تہذیب بہت کچھ ان کی رہینِ منت ہے، امید ہے کہ مسلمانوں پر بھی ان حلقوں کا بہت مفید اثر پڑے گا، الجزائر میں پانچ پادریون نے ایک چھوٹا سا حلقہ قائم کرکے اس تحریک کی ابتدا کردی ہے،

"ع ز"

# امریکہ میں سرطان کے علاج کی تدبیرین

یون تو کینسر یا سرطان کا مرض تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے لیکن امریکہ میں اسکی بڑی کثرت ہے، اور ہر سال تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی اس کے شکار ہوتے ہیں، ۱۹۰۰ء میں وہاں اس مرض کا نمبر اسبابِ موت میں چھٹا تھا، مگر اب دوسرا ہے، اور صرف امراضِ قلب ہی اس سے زیادہ ہیں، گذشتہ ستمبر میں لندن یونیورسٹی، امریکہ کے کینسر انسٹی ٹیوٹ میں انگلستان، یورپ اور امریکہ کے ماہرینِ سرطان نے جمع ہوکر اس مرض سے مقابلہ کرنے کیلئے نقشۂ جنگ تیار کر لیا ہے، اس وقت تک سبکو یہ تسلیم ہے کہ سرطان کا اصلی سبب معلوم نہ ہوسکا اور نہ یقین کیساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرض موروثی ہے یا نہیں علاوہ برین ابتک اسکا کوئی قطعی اور مجرب علاج بھی معلوم نہیں

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرطان کے علاج میں اب تک کوئی ترقی نہیں ہوئی، بعض اقسام کے سرطان خصوصاً جلد، منہ اور سینہ کے موافق حالات میں علاج پذیر ہوتے ہین، اگر صحت کے بعد پانچ سال تک سرطان پھر نہ ابھرے تو ازالہ کو مستقل سمجھنا چاہئے، ۱۹۳۳ء میں امریکہ کے ان لوگون کا شمار کیا گیا تھا جنکو صحت کے بعد پانچ سال تک پھر شکایت نہیں ہوئی، انکی تعداد تقریباً (۲۴۴۴۰) تھی،

سرطان کوئی متعدی مرض نہیں ہے، اور نہ وراثت سے پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ایک عالمگیر مرض ہے، اور نہ صرف انسان بلکہ حیوانات اور نباتات بھی اس سے محفوظ نہیں، اسکی شکایت زمانہ قبل تاریخ مین بھی تھی، قدیم مصریوں کو بھی اس کا تجربہ تھا، ہندوستان کی بعض قدیم ترین طبی کتابوں میں بھی اسکا ذکر ہے،



اسلئے یہ خیال صحیح نہیں جیسا کہ عطائیون نے مشہور کر رکھا ہے کہ یہ مرض موجودہ زمانہ کی پیداوار ہے، اور چیچک کے ٹیکہ سے یا ان چیزون کے کھانے سے جو ٹن کے ڈبون میں بند رہتی ہین، یا الیومنیم کے برتن میں کھانا پکانے سے پیدا ہوتا ہے،

سرطان کے علاج کے لئے سینکڑون دوائیں لوگوں میں مشہور ہین، چنانچہ حال میں نیویارک کے ایک متمول مریض نے جب ازالۂ مرض کے لئے انعام کا اعلان کیا، تو اُسے ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نسخے بتائے گئے ان سب میں کوئی نہ کوئی جزو مشترک تھا لیکن کوئی نسخہ کارگر ثابت نہ ہوا، موجودہ تحقیق کی رو سے اسکا علاج اگر کامیاب ہوسکتا ہے، تو صرف جراحی اور ریڈیم کی شعاعون سے، لیکن جراحی یا ریڈیم کوئی بھی کافی نہیں ہوسکتا جب تک مرض شروع ہی میں نہ معلوم کر لیا جائے، اور اس کا علاج فوراً نہ شروع کر دیا جائے، چند دنوں کی تاخیر سے ہلاکت کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، اس مرض میں خطرناک علامتیں یہ ہین :- (۱) سینہ یا جسم کے کسی دوسرے حصہ میں کوئی دمبل خصوصاً وہ جو بڑھنے یا شکل تبدیل کرنے لگے، (۲) کوئی زخم خصوصاً چہرہ یا منہ کا جو مندمل نہ ہوتا ہو، (۳) جسم کے کسی حصّے سے خون کا غیر معمولی طور پر خارج ہونا، جن لوگون کو ان میں سے کوئی شکایت بھی ہو، انھین چاہئے کہ فوراً کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرین،

یہ اب تک دریافت نہ ہوسکا کہ سرطان کی ابتدا کیسے ہوتی ہے، ہونٹ اور منہ کا سرطان دانتون کی خرابی اور تمباکو خصوصاً پائپ پینے سے ہوسکتا ہے، اگرچہ لاکھون ایسے ہیں، جن کے دانت خراب ہیں اور وہ تمباکو بھی پیتے ہیں، لیکن اس مرض سے محفوظ ہیں، پیٹ کا سرطان سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، اس کے اسباب مختلف ہوسکتے ہیں، کبھی بہت گرم گرم کھانا کھانے یا بہت جلد جلد کھانے سے بھی ہوجاتا ہے، اور کبھی پیٹ کے کسی زخم سے غفلت برتنا بھی اس کا سبب ہوتا ہے، بعض اوقات رنگ سازون کے سرطان جلد میں رنگ کے پیوست ہوجانے سے پیدا ہوجاتے ہین، کوئلہ کے ذرّون کے باعث کانون کے مزدورون میں پھیپھڑے کا سرطان ہوسکتا ہے،

(ل ۔ ڈ) "ع ز"

# اخبارِ علمیہ

## عربی کی چند نادر کتابیں

پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے کتب خانہ میں چند قدیم اور نادر قلمی کتابیں حال میں دستیاب ہوئی ہیں ان میں امام غزالی کی احیاء العلوم کے دو نسخے جو چودھویں صدی عیسوی کے لکھے ہوئے ہیں، ڈاکٹر نبیہ فارس ان نسخوں کی تصحیح ناقدانہ طور پر کر رہے ہیں، کیونکہ یہ کتاب جدید طرز تنقید کے لحاظ سے کبھی مکمل طور پر اڈٹ نہیں کی گئی، علاوہ بریں وہ اس کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں کر رہے ہیں، کیونکہ اب تک کسی یوروپین زبان میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا، اور نادر کتابوں میں زکریا رازی (متوفی ۹۲۳ء) کا ایک رسالہ بھی ہے جو طب پر ہے، اور ۱۲۲۸ء کا لکھا ہوا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ اس رسالہ کا یہی ایک نسخہ اب باقی رہ گیا ہے، رازی پہلا شخص تھا، جسنے خسرہ اور چیچک میں سائنٹفک طریقہ پر امتیاز قائم کیا، طب پر ایک دوسرا رسالہ بھی ملا ہے، جو ابن نفیس (متوفی ۱۲۸۸ء) کے اصل نسخہ سے ۱۲۹۲ء میں نقل کیا گیا ہے، اس میں پھیپھڑوں کے دوران خون پر مستقل بحث ہے، عام خیال یہ ہے کہ دوران خون کا یہ نظام اول اول اسپین کے ایک فاضل مائیکل سروٹیس (MICHAEL SERVETUS) نے دریافت کیا تھا، جو ابن نفیس سے تقریباً تین صدی بعد گذرا ہے، الفرغانی (متوفی ۸۶۱ء) کا ایک رسالہ ہیئت پر دستیاب ہوا ہے جس کا ترجمہ لاطینی اور عبرانی میں بار بار کیا جا چکا ہے، اور جس کی اشاعت یورپ میں ہیئت کے دوسرے رسالوں سے زیادہ ہوئی ہے، پروفیسر ہٹی (HITTI) پرنسٹن یونیورسٹی کا خیال ہے، کہ طب کے بعد غالباً ہیئت



ہی وہ مضمون ہے، جس پر قرون وسطیٰ کے عرب فاضلوں نے سب سے زیادہ لکھا ہے، ایک مخطوط اور بھی بہت اہم نکلا ہے، یہ دور اندازی، آتشبازی اور سرنگ بنانے کے فن پر ہے، اور عثمان المعتمدی کی تصنیف ہے جو بظاہر ایک ترک معلوم ہوتا ہے، اور دریاے والگا پر قلعۂ بلغار میں متعین تھا، یہ رسالہ ۱۵۵۳ء کا لکھا ہوا ہے اور (۱۶۰) صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بکثرت نقشے اور شکلیں دی ہوئی ہیں،

## عربی صحافت

بیروت کی امریکن یونیورسٹی کی طرف سے اُن تمام عربی اخبارات و رسائل کی ایک فہرست شائع ہوئی ہے، جو ۶ دسمبر ۱۸۷۵ء کو التنبیہ (اسکندریہ) کی اشاعت سے لیکر ۱۹۲۹ء تک نہ صرف ان ملکوں میں جہاں عربی بولی جاتی ہے، بلکہ یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں شائع ہوئے ہیں، ان اخبارات اور رسائل کے بانیوں کے نام اور ان کی اولین اشاعت کی تاریخیں بھی صحت کیساتھ درج کی گئی ہیں، مسلم ورلڈ کا نامہ نگار اس میں صرف اسقدر اضافہ اور کرتا ہے کہ لسان العرب دمشق سے منتقل ہونے کے بعد بغداد میں پہلی بار ۲۳ جون ۱۹۲۱ء کو نکلا تھا، اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے، کہ تعداد کے لحاظ سے مصر کا نمبر سب زیادہ ہے، جہاں عربی رسائل کی تعداد (۱۲۹۰) ہے، لیکن آبادی کے نقطۂ نظر سے لبنان بڑھا ہوا ہے، جہاں اوسطاً دو ہزار باشندوں کے لئے ایک رسالہ ہے، جب کہ مصر میں دس ہزار کے لئے ایک اور بعض دوسرے عربی ممالک میں چھ لاکھ کے لئے ایک ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شہروں میں جو عرب سے دور واقع ہیں، مثلاً نیویارک جہاں سے (۵۲) رسالے نکلتے ہیں، ساؤ پالو (جنوبی امریکہ) جہاں سے (۹۴) اور بیونس ایریز (جنوبی امریکہ) جہاں سے (۲۹) رسالے نکلتے ہیں، عربی رسالوں کی اشاعت کہیں زیادہ ہے، بہ نسبت ان بہتیرے شہروں کے جو ایسے ملکوں میں واقع ہیں، جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے، مثلاً یروشلم، ٹریپولی، طنطہ، یافہ، الجزائر، اور بصرہ

اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے، کہ شام سے منتقل ہو کر لوگ بکثرت شمالی اور جنوبی امریکہ میں آباد ہو گئے ہیں،

## امریکہ کی سب سے قدیم یونیورسٹی

گذشتہ ستمبر میں امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی نے اپنی سہ صد سالہ جوبلی کی تقریب نہایت شاندار طریقہ پر منائی، تمام دنیا کے فضلاء اس میں مدعو کئے گئے تھے، چنانچہ غیر ممالک کے نمایندوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی،

ہارورڈ (HARVARD) ریاستہائے متحدہ امریکہ کی پہلی یونیورسٹی ہے، یہ ۱۶۳۶ء میں قائم ہوئی تھی یعنی حکومت ریاستہائے متحدہ سے بھی (۱۴۰) سال قبل، یہ امریکہ کی پہلی یونیورسٹی ہے جسکی ڈگریوں کو آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں نے ۱۶۵۰ء ہی میں اپنی ڈگریوں کے برابر تسلیم کر لیا، پہلی آنریری ڈگری جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے کسی صدر کو ملی، وہ اسی یونیورسٹی کی تھی، اور ۱۷۷۶ء میں جارج واشنگٹن کو دی گئی تھی، یہ پہلی امریکن یونیورسٹی ہے، جس کے فارغ التحصیل طلبہ نے ایک دوسری یعنی ییل (YALE) یونیورسٹی ۱۷۰۱ء میں قائم کی، تاریخ امریکہ کی تعلیم کی ابتدا بھی ۱۶۳۸ء میں سب سے پہلے اسی یونیورسٹی میں ہوئی، ۱۶۳۶ء میں ہارورڈ کالج کے لئے جو شروع میں پادریوں کی تعلیم کی غرض سے قائم کیا گیا تھا، حکومت کی طرف سے چار سو پونڈ منظور ہوئے تھے، اسی سرمایہ سے ایک سہ منزلہ عمارت بنا دی گئی تھی، لیکن آج اس یونیورسٹی کی عمارتوں کی قیمت ڈھائی کرور ڈالر ہے، ۱۶۳۸ء میں پادری جان ہارورڈ (REW. JOHN HARVARD) نے جو انگلستان کا باشندہ اور شکسپیر کا دوست تھا، اپنی وفات کے وقت اپنا کتب خانہ اور نصف جائداد اس کالج کے نام لکھ دی، کتب خانہ چار سو جلدوں پر مشتمل تھا، اور نصف جائداد کی قیمت آٹھ سو پونڈ تھی، کالج اب تک بے نام تھا، اس وصیت کے بعد اس کا نام ہارورڈ کالج رکھ دیا گیا،



طلبہ کی تعداد میں بہ نسبت پہلے کے زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے، سترہویں صدی میں ہر درجے میں تین سے لیکر نو لڑکے تک رہتے تھے، ۱۶۴۲ء میں پہلے گریجویٹ کلاس میں صرف نو لڑکے تھے، اب یونیورسٹی کے ابتدائی درجہ کا اوسط (۱۱۰۰) رہتا ہے، ۱۹۳۶ء میں (۰،،) طلبہ وہاں سے گریجویٹ ہو کر نکلے ہیں، مصارف میں بھی ایسا ہی فرق ہو گیا ہے، سترہویں صدی میں ہارورڈ کا طالب علم پچاس ڈالر سالانہ میں کفایت شعاری کے ساتھ تعلیم اور خورد و نوش کے اخراجات پورے کر سکتا تھا، اب نہایت کفایت شعاری سے رہنے پر بھی تیرہ سو ڈالر سالانہ سے کم کا خرچ نہیں ہے، اگر کلب اور سیر و تفریح کے مصارف بھی شامل کر لئے جائیں، تو چھ ہزار ڈالر سے زائد چاہئیں،

ہارورڈ یونیورسٹی کے زندہ فارغ التحصیل طلبہ کی تعداد اسوقت ستر ہزار سے کچھ اوپر ہی ہے

## سوویٹ روس کی آیندہ مردم شماری

۶ جنوری ۱۹۳۷ء کو سوویٹ روس کی آیندہ مردم شماری ہونے والی ہے، جس وسیع پیمانہ پر اسکی تیاریاں ہو رہی ہیں، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ہو گا:-

اس مردم شماری میں بارہ لاکھ شمار کنندگان اور ایک لاکھ بیس ہزار حکام کام کرینگے، ایک ہزار ٹن سے زائد کاغذ کی ضرورت ہو گی جس پر پانچ کروڑ پچاس لاکھ مردم شماری کے فارم چھاپے جائیں گے، خاص مشینین تیار کی جا رہی ہیں، جن سے اعداد شمار کئے جائیں گے، مردم شماری کے دفتر جابجا قائم کر دیئے گئے ہیں، اور ملک کے بعض شمالی حصوں میں جو موسم سرما میں ناقابل گذر ہو جاتے ہیں، مردم شماری کا کام شروع بھی کر دیا گیا ہے، جنوری ۱۹۳۳ء میں سوویٹ روس کی آبادی (۱۶۵،۷۷۱،۴۰۰) تھی، امید کی جاتی ہے کہ آیندہ مردم شماری میں سترہ کرور تک پہونچ جائے گی،

"ع ز"

# ادبیات

## دعا

از جناب اسد صاحب بی اے ملتانی،

اے دل تو ہی بتا کہ میں مانگوں خدا سے کیا
ہوتا ہی ہے جہان میں میری رضا سے کیا،

ہے زیست اپنے بس میں نہ موت اختیار میں
مطلب ہیں پھر اپنی فنا و بقا سے کیا،

طوفاں کا زور و شور ہے دریا ہے موجزن
آب و ہوا کو آرزوئے ناخدا سے کیا،

وقت معینہ پہ خزاں آئے گی ضرور،
ہوتا ہے عندلیب کے شور نوا سے کیا،

اس کے سوا کہ دل کا نکل جائے کچھ بخار
ہوتا ہے غم نصیب کی آہ و بکا سے کیا

جو حلقۂ کمان قضا سے نکل چکا،
رک جائے گا وہ تیر میری التجا سے کیا

وہ بھی تو اپنے کام میں مجبور محض ہیں،
شکوہ کروں میں کارکنان قضا سے کیا

ہر بات سے وہ قادر مطلق ہے بے نیاز
اسکو بھلا غرض ہے میرے مدعا سے کیا

اٹھتے ہیں خود بخود مرے دست دعا اسد
ہر چند سوچتا ہوں کہ ہوگا دعا سے کیا،

## سخن ماہر

از جناب ماہر القادری صاحب،

آرزو اک فریب باطل ہے،
عشق ہی آپ اپنا حاصل ہے،



عیش و غم سے فراغ حاصل ہے
بیخودی پوچھنے کے قابل ہے،

مرحبا اے وفور ناکامی،
تو مری کوششوں کا حاصل ہے

مختلف ہیں حیات کے پہلو
موت بھی اک اسی کی منزل ہے

عیش ہے وہم، رنج و غم ہے خیال
زیست کا ہر نظام باطل ہے

نبض امید چھٹ گئی شاید
آج دل کیوں سکوں پہ مائل ہے

درد میں کیوں سکون پاتا ہوں
زہر بھی کیا دوا میں شامل ہے

میں ہوں اور موج بحر غم ماہر
غم کشتی نہ فکر ساحل ہے

## کیف تغزل

جناب مولوی محمد مبین صاحب کیفی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد

تا بہ دامن وسعت چاک گریباں کیجئے
بن پڑے تو ہوش میں وحشت کا ساماں کیجئے

چشم نظارہ کو خیرہ، دل کو حیراں کیجئے
آئیے کچھ ہمت دیدار جاناں کیجئے،

کیجئے اجزائے ہستی کو پریشاں کیجئے
اور پھر ان کو غبار کوئے جاناں کیجئے،

ہے یہی وسعت عدم کی، ہے یہی حد وجود
یا نہیں کر دیجئے یا لطف "ہاں" کیجئے،

ہے ادب کا ترک یہ ہنگامۂ بحث وجود
کھوئیے اپنے کو تو پھر اس کا ارماں کیجئے

جی میں ہے یوں آج سنئے نغمۂ ساز حیات
دل کو مضراب ہر تار رگ جاں کیجئے

ہے جہاں میں سب سے آگے سر حد ادراک عشق
یعنی دل کو بے نیاز کفر و ایماں کیجئے

اس کا جلوہ دیکھ کر اپنے کو بھولا آپ ہی
آہ کس کے سامنے دعوائے عرفاں کیجئے

لعل لب ہم رنگ غنچہ، رنگ رخ رنگ بہار
آئیے نظارۂ فصل بہاراں کیجئے

گردشیں اب دہر کی کتنی ہیں کیفی کیا کہوں
زندگی بھر شکوۂ جور عزیزاں کیجئے

# باب التقریظ والانتقاد

## اہل ہند کی زندگی اور حالات (۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک)

از جناب ڈاکٹر کنور محمد اشرف صاحب پی ایچ ڈی، ناشر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ، ضخامت ۹۵ صفحے، قیمت [illegible]

مسلمانوں کے عہد پر آج تک جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، وہ بادشاہوں کی سیاسی جنگ اور خانگی خونریزی اور ان کے ملکی اداروں اور حکمت عملی سے متعلق ہیں، عوام کے خانگی، معاشرتی، اجتماعی اور اقتصادی حالات کو ان میں بہت کم جگہ ملی ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں جب کوئی صاحب قلم ان گذشتہ تاریخوں کی مدد سے سیاسی اور جنگی واقعات کے علاوہ کچھ اور لکھنا چاہتا ہے، تو اس کا یہ کام نہ صرف مشکل اور صبر آزما بلکہ اکثر اوقات حوصلہ شکن ثابت ہوتا ہے، اس کتاب کے مؤلف نے اسی مشکل، صبر آزما اور حوصلہ شکن کام کو انجام دیا ہے، انھوں نے اپنی اس تالیف کے لئے اس عہد کی عام تاریخوں کے علاوہ ہر قسم کی نظم و نثر کتابیں پڑھیں، اور ان سے ذرہ ذرہ چند معلومات کا یہ ذخیرہ فراہم کیا ہے،

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے، پہلا سیاسی، دوسرا اقتصادی اور تیسرا معاشرتی حالات پر ہے، سیاسی حالات میں لڑائیوں اور مہموں کا تذکرہ نہیں، بلکہ "سلاطین دہلی کی حکومت اور اس کا رد عمل مسلمانوں کی معاشرت پر" "سلطان خانگی زندگی میں" "سلطان پبلک زندگی میں" "شاہی دربار کی تہذیب" "طبقہ امراء" "مذہبی گروہ" جیسے عنوانات پر معلومات ہیں، اقتصادی حالات میں "دیہی زندگی" "زمین کی پیداوار" "دیہی صنعت" "گھریلو صنعت" "دیہات کی اقتصادی زندگی کے معیار" "پارچہ بافی" "پتھر اور اینٹ کے کام" "کاغذ و شکر سازی" "چرم سازی" "صنعتی کاموں کی نوعیت" پھر بیرونی، بحری اور بری تجارت، اور اس کے بعد مختلف معاشرتی جماعتوں کے معیار زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، معاشرتی حالات کے سلسلہ میں یہ عنوانات قائم کئے گئے ہیں، مشترکہ خاندان، عورتوں کی حیثیت، پردہ اور دونوں صنفوں کے معاشرتی ارتباط، خانگی واقعات، شادی، موت، ستی، جوہر، شہر کا نقشہ، شاہی مکانات کے حصے، فرنیچر، پوشاک اور کپڑے، سامان آرائش و زیورات، غذا، سامان، تفریح، فوجی و جسمانی کھیل، پولو، گھوڑ دوڑ، شکار، گھریلو کھیل، ہندوؤں کے تہوار، مسلمانوں کے تہوار، سلطنت کی تقریبات، ناچ گانا، عام عادات و اطوار وغیرہ،



ان واقعات کی تفصیل میں مؤلف نے ہندو اور مسلمان دونوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے، موجودہ دور میں جب کوئی صاحب قلم اس قسم کی مساعی جمیلہ میں مصروف ہوتا ہے، تو قومی جذبہ سے مغلوب ہوکر صرف اپنے ہم قوم کے حالات و واقعات کو روشن کرتا ہے، اور ہمسایہ قوموں کی تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن مؤلف مذکور نے اپنی کتاب میں ہندو مسلمان دونوں کی معاشرت یکساں طور پر دکھائی ہے، اور پھر نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ واقعات پر جذبہ اور عصبیت کی لہریں کہیں موجزن نہیں، مؤلف نے صرف تفصیلات اور جزئیات لکھ دیتے ہیں، ان سے نتائج مرتب کرنا ناظرین پر چھوڑ دیا ہے،

اس سلسلہ میں مؤلف نے ایک موضوع کو کافی تشنہ چھوڑ دیا ہے، ہندو اور مسلمان دو مختلف تمدنوں کے علمبردار تھے، مگر دونوں کے ارتباط سے دونوں کی معاشرت، تہذیب اور مذہب میں اہم عناصر و اجزاء پیدا ہوتے گئے، لیکن اس انقلاب پر مؤلف کی نگاہیں دور تک نہیں پہنچ سکی ہیں، یہ موضوع زیر نظر کتاب کے لئے ہر لحاظ سے دلچسپ اہم اور مفید ہوتا،

مؤلف نے چونکہ ایک اچھوتے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اسلئے اس کو اپنے فرض کے انجام دینے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لینا پڑا ہے، سیاسی واقعات کی تفصیلات سے جزئیات اور معاشرتی جزئیات سے تفصیلات پیدا کی ہیں، یہ تاریخی استنباط و استنتاج کا راستہ بے حد پر خطر ہے جزئی

واقعات سے کلی نتیجہ نکالنے میں بسا اوقات ٹھوکریں لگتی ہیں، اس راہ میں مصنف کا اعتدال قابلِ داد ہے، مؤلف نے نہ صرف معاصر تاریخوں بلکہ نظموں، تصوف اور فقہ و قانون کی کتابوں سے بھی مدد لی ہے، فقہ، قانون اور قصوں سے تمدن، معاشرت اور طرزِ ماند و بود کے بہت سے مسائل و معلومات بڑی دقتِ نظر سے فراہم کئے ہیں،

مؤلف نے معلومات کا ایک گوشہ قصداً چھوڑ دیا ہے، یعنی صوفیاے کرام کی تصنیفات اور ملفوظات، حالانکہ ان کتابوں مثلاً حضرت فرید شکر گنج حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شرف الدین یحیٰی منیری، اور حضرت مخدوم عبد الحق ردولوی وغیرہ کے ملفوظات میں معلومات کا وافر حصہ مل سکتا ہے، "ص ع"

## مختصر تاریخِ ہند

از مولینا سید ابو ظفر صاحب ندوی،

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرزِ بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریقِ مذہب و ملت معلوم ہو جائیں،

ضخامت :۔ ۲۰۰ صفحے، قیمت :۔ عہ

## مقالاتِ شبلی جلد چہارم

مولینا کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ضخامت ۱۵۰ صفحے، قیمت :۔ عہ

"منیجر"



# مطبوعاتِ جدیدہ

**منظرِ آئینہ و جواہرِ آئینہ**:۔ مؤلفہ جناب محمد احمد صاحب بنجود موہانی، ایم اے پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ، تقطیع چھوٹی، حجم علی الترتیب ۶۹ و ۴۲ صفحات کاغذ سپید، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۱ر و ۵ر، مصنف سے اوپر کے پتہ سے مل سکتی ہے،

کئی سال ہوئے پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی لکھنؤ یونیورسٹی نے ہندوستانی زبان کی شاعری کی مدافعت میں "ہماری شاعری" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، جو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں انعام کی مستحق قرار پائی، اور اس وقت وہ بی اے کے نصاب میں داخل ہے، اوپر کے دونوں رسالے اسی کتاب کی تنقید میں ہیں، ہماری نظر سے بھی یہ کتاب گذری ہے، اس میں شک نہیں کہ کتاب خامیوں سے پاک نہیں ہے، خصوصاً بعض تاویلیں بہت دور از کار اور بعض تشریحیں محلِ نظر ہیں، مثالوں کے انتخاب میں زیادہ تلاش سے کام نہیں لیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود ہندوستانی شاعری کی مدافعت میں اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی ہے، ہم کو بنجود صاحب کی سخن سنجی اور ناقدانہ نگاہ سے انکار نہیں، لیکن ہم کو ان کے اصولِ تنقید سے اختلاف ہے، تنقید کے معنی یہ ہیں کہ اختصار اور تعین کے ساتھ اغلاط اور نقائص دکھا دیے جائیں، اگر اشعار کا تجزیہ اور تحلیل کر کے اور خاص مقدمات قائم کر کے ان سے نتائج نکالے جائیں تو ہمارے خیال میں کوئی شعر تنقید سے نہیں بچ سکتا، کہ اس طرز تنقید میں بڑی وسعت ہے، اور ہر شخص کا ذوق و وجدان جدا جدا ہے، پھر جناب ناقد نے اصل شے یعنی رضوی صاحب کے نفس خیالات و آرا،

پر بہت کم تنقید کی ہے، بلکہ زیادہ تر ان کی پیش کردہ مثالوں کی تشریح پر ہے، یہ ہو سکتا ہے، کہ رضوی صاحب کی پیش کردہ مثالوں سے بہتر اور واضح تر مثالیں ملجائیں، لیکن ان کو غلط کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، البتہ بعض مثالوں اور خصوصاً ان کی تشریحات سے ہم کو بھی اتفاق نہیں ہے، بہرحال اس تنقید سے یہ ایک بڑا فائدہ ہوا کہ جناب نجو د جیسے ادیب کے قلم سے زبان و ادب کے متعلق بعض مفید ادبی معلومات کا ہماری زبان میں اضافہ ہوا،

**اسباب زوالِ امت**، مصنفہ امیر شکیب ارسلان، مترجمہ مولانا احسان سامی حقی بک، شائع کردہ سیرت کمیٹی تقطیع چھوٹی، حجم ۸۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۲؎ جو لوگ زیادہ تعداد میں خرید نا چاہتے ہیں ان کو اسی روپیہ ہزار دس روپیہ سیکڑہ اور روپیہ میں آٹھ ملے گی، پتہ سیرت کمیٹی پٹی ضلع لاہور،

یہ رسالہ دنیائے اسلام کے نامور صاحبِ قلم اور مخلص مسلمان امیر شکیب ارسلان کی تصنیف اور سیرت کمیٹی کے مفید نشریات کی ایک کڑی ہے، اسمیں فاضل مصنف نے عقل، مذہب، تاریخ اور روایات کی روشنی میں دکھایا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب، جانی و مالی جہاد سے ان کی پہلو تہی، دین و وطن سے غداری، جہالت، کم علمی، اخلاقی زوال، بزدلی، الحاد و بے دینی، اور تنگ خیالی و قدامت پرستی ہیں، پھر اس عامیانہ اعتراض کی تردید میں کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب خود ان کی تہذیب ہی، دنیا پر اسلامی تہذیب کے برکات اور احسانات دکھائے ہیں، آخر میں علم و حکمت کی تحصیل کی ترغیب میں آیات قرآن پیش کی گئی ہیں، ہر بحث شواہد سے مدلل ہے، یہ مفید رسالہ عوام سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقہ کے پڑھنے کے لائق ہے،

**جدید خطبات جمعہ**، مرتبہ مولانا خطیب رازی صاحب تقطیع چھوٹی، حجم ۴۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۲؎ ممبران کمیٹی سیرت کے لئے ارتبہ، پتہ سیرت کمیٹی پٹی، ضلع لاہور،



آجکل خطبہ جمعہ کا حقیقی مقصد بالکل فوت ہو گیا ہے اور اس کی جگہ محض رسمی خطبہ رہ گیا ہے، ہندوستان میں بارہا خطباتِ جمعہ کو باکار بنانے کی تحریک کی گئی، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکی، سیرت کمیٹی نے اس ضرورت کو محسوس کر کے ہندوستانی زبان میں فی الحال سات خطبات مرتب کرائے ہیں، پہلا خطبہ خطباتِ جمعہ کی اہمیت اور اس کے حقیقی اغراض و مقاصد کی تشریح میں ہے، دوسرا خدا کی توحید، تیسرا فلسطین کی مظلومی، چوتھا تعلیم، پانچواں تبلیغِ دین، چھٹا اسلامی برادری، ساتواں اسلام میں فرقہ بندی پر، ہر خطبہ کے مقصد کو نہایت اختصار اور خوبی کے ساتھ واضح کیا گیا ہے، ان کو عربی خطبہ کے قبل یا بعد پڑھنا عام مسلمانوں کے لئے مفید ہوگا،

**تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام**، شائع کردہ مولوی وحید الحسن صاحب صدیقی تقطیع چھوٹی، حجم ۴۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت درج نہیں، پتہ وحید الحسن صاحب جنرل سکریٹری انجمن ہدایت الاسلام لکھنؤ،

یہ وہ مضمون یا دعوت نامۂ اسلام ہے، جو لکھنؤ کی گذشتہ جملہ مذاہب کی کانفرنس کے موقع پر دار المبلغین کی جانب سے اچھوت اقوام کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اس میں اسلام کی ان خصوصیات اور تعلیمات کو جو عقلی حیثیت سے اسکی صداقت کا ثبوت، اخلاقی اور عملی حیثیت سے انسانوں کی دنیوی اور اخروی فلاح کی ضامن، اور حریت اور مساوات کے نقطۂ نظر سے قابلِ قبول ہو سکتی ہیں، آیاتِ قرآنی سے دکھایا گیا ہے، اور اس کی تائید میں غیر مذاہب کے علماء کی شہادتیں بھی پیش کی گئی ہیں، زبان صاف سادہ اور انداز بیان سنجیدہ اور دلنشیں ہے، کسی مذہب پر کوئی حملہ نہیں ہے، یہ رسالہ غیر مسلموں خصوصاً پڑھے لکھے اچھوتوں میں تقسیم کرنے کے لائق ہے، لیکن تبلیغِ اسلام کے سلسلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور اسامہ ابن زیدؓ کے قنوج آنے کی روایت بالکل مہمل ہے،

**اسلام اور اشتراکیت**، شائع کردہ خانبہادر محمد یوسف آنریری مجسٹریٹ دہلی

تقطیع اوسط، حجم ۱۲۴ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت نہایت معمولی خان بہادر صاحب سے بلاقیمت مل سکتی ہے،

یہ کتاب جیسا کہ اس کے سرورق سے واضح ہوتا ہے، کسی عالم دین بزرگ کی تصنیف ہے جنھوں نے کسی مصلحت سے اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے، اس میں اشتراکیت کی مختصر تاریخ اور اسکے اصول ونظام کو واضح کرکے اسلام اور قرآنی تعلیمات سے ان کا تضاد اور ان کے ہولناک نتائج دکھائے گئے ہیں، پھر اس کے مقابلہ میں اشتراکیت اور اس کے بنیادی تخیل کے متعلق اسلامی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے،

**آشوبِ زمانہ** مصنفہ ایم اسلم صاحب تقطیع چھوٹی حجم ۰، صفحات، کاغذ سپید کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ :- ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب بل روڈ لاہور،

یہ کتاب پنجاب کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم صاحب کی تازہ تالیف ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ اسلم صاحب کو راوی کے کنارے "کسی کے نام کسی کے خط" کا ایک ٹکڑا بہتا ہوا ملتا ہے، شاعر تحریر کی دلکشی دیکھ کر صاحب تحریر سے خیالی مراسلت شروع کر دیتا ہے، آشوبِ زمانہ انہیں خطوط کا مجموعہ ہے، اس میں حسن وعشق کے نکات، مردوں اور عورتوں کی نفسیات موجودہ تہذیب ومعاشرت اور رسوم کے بعض مضر پہلوؤں پر دلچسپ شاعرانہ تنقید کیگئی ہے بیچ بیچ میں بعض تمثیلی افسانے بھی آگئے ہیں "م"

**کنز المحاورات فارسی** از مولینا شاہ محمد وارث امام صاحب قادری پھلواروی، شائع کردہ مجیب منزل پھلواری شریف ضخامت ۲۰۰ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ قیمت عمر

طلبہ کی دشواریوں کا لحاظ کرکے جو کتابیں عام طور پر لکھی جاتی ہیں، ان میں یہ تالیف خصوصیت کیساتھ مفید معلوم ہوتی ہے، اس میں فارسی زبان کے تقریباً ڈھائی ہزار محاورات کا ترجمہ حروف تہجی کی ترتیب کیساتھ اردو اور انگریزی میں درج ہے، امید ہے کہ یہ کتاب اسکولوں اور کالجوں میں بہت مقبول ہوگی، طلبہ کے حلقہ کے باہر بھی اس سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے "ع ز"

جلد ۳۸ | ماہِ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء | عدد ۶

مضامین


| مضمون | مضمون نگار | صفحات |
| --- | --- | --- |
| شذرات | سید سلیمان ندوی، | ۴۰۲-۴۰۴ |
| کتبخانۂ حمیدیہ | " | ۴۰۵-۴۱۱ |
| دیوان شمس تبریز اور مولانائے روم، | جناب پروفیسر غلام دستگیر صاحب رشید ایم اے، نظام کالج، حیدرآباد دکن، | ۴۱۲-۴۲۵ |
| کلام خواجہ سنائی غزنویؒ، | جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی | ۴۲۶-۴۲۸ |
| اسلام سوڈان میں، | مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دار المصنفین، | ۴۲۹-۴۳۸ |
| عباسی دربار کے اثرات عربی ادب وثقافت پر | جناب عبد القیوم صاحب ایم اے ریسرچ اسٹوڈنٹ پنجاب یونیورسٹی، | ۴۳۹-۴۴۷ |
| کائنات بغیر خدا کے | "ع ز" | ۴۴۸-۴۵۲ |
| مدت حیات کی توسیع، | " | ۴۵۳-۴۵۵ |
| اخبار علمیہ | " | ۴۵۶-۴۵۹ |
| حمایت اسلام کا مطبوعہ قرآن پاک، | "س" | ۴۶۰-۴۶۳ |
| "نقش ونگار" | شاہ معین الدین احمد ندوی، | ۴۶۴-۴۷۵ |
| مطبوعات جدیدہ، | " | ۴۷۶-۴۸۰ |